جلد ۱۲۶ ماہ صفر المظفر ۱۴۰۱ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۸۰ء عدد ۶

مضامین

شذرات — سید صباح الدین عبدالرحمن ۳۹۰-۳۹۲

مقالات

شیخ شیوخ العالم حضرت بابا فرید مسعود گنج شکرؒ کے مجموعۂ ملفوظات اسرار الاولیاء کا مطالعہ — جناب مولانا اخلاق حسین دہلوی ۳۹۳-۴۱۶

امام الحرمین عبدالملک جوینی — جناب مولوی نصیر احمد صاحب پھلواروی ۴۱۷-۴۳۷

کراچی کا ایک مکتوب — جناب حسام الدین راشدی ۴۳۸

ادبیات

غزل — جناب نسیم احمد نسیم ایڈوکیٹ شاہ جہان پور ۴۳۹

" — جناب محمد حسین فطرت بھٹکلی "

باب التقریظ والانتقاد

مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ پر ایک اہم کتاب — سید صباح الدین عبدالرحمن ۴۴۰-۴۵۹

مطبوعات جدیدہ — "ض" ۴۶۰-۴۶۴

اعلان

معارف کی سالانہ قیمت اب تک ۱۵ روپیے تھی، کاغذ، کتابت و طباعت کی روز افزوں گرانی کی وجہ سے جنوری ۱۹۸۱ء سے ۲۰ روپیے سالانہ کی جاتی ہے، قدر دانِ معارف اسکو نوٹ فرمالیں۔

منیجر دار المصنفین

شذرات

معارف کے گذشتہ شذرات میں چودہ سو سال کے اندر مسلمانوں میں جو غدار پیدا ہوئے، اور ان سے ملت کو جو نقصان پہونچا، اس کا ذکر آیا تھا، اس برصغیر میں ایسے غداروں کا ذکر رہ گیا تھا،

اس کا جائزہ ہم اس وقت سے لیتے ہیں جب کہ دہلی میں مسلمانوں کی باضابطہ حکومت قطب الدین ایبک نے سنہ ۶۰۲ھ میں قائم کی، وہ صرف پانچ سال تک حکمران رہا، اس کی وفات کے بعد جانشینی میں سخت اختلاف ہوا، اس وقت کے مسلمانوں اور خصوصاً امراء کو اس نوزائیدہ سلطنت کو بچانے کی خاطر متحد رہنا چاہئے تھا، مگر ان کی باہمی آویزش سے قطب الدین ایبک کا جانشین آرام شاہ ہلاک ہوا، اس کا داماد ناصر الدین قباچہ سندھ کا حکمراں بن بیٹھا، لکھنوتی میں علی مردان خان نے دہلی سے کٹ کر اپنی آزادی کا اعلان کر دیا، دہلی کے قرب و جوار کے علاقے کا مالک شمس الدین التمش ہوا، ایک مرکزی حکومت سے گریز پائی کرکے علاقائی آزادی کے ان علم برداروں نے جس طرح ایک نئی حکومت کو نقصان پہونچایا، ان کو کیا کہا جائے گا، کیا وہ مفاد پرست غدار نہ تھے،

سلطان شمس الدین التمش نے از سر نو اس سلطنت کو مستحکم کیا، مگر اس کی وفات کے بعد پھر جانشینی کی لڑائی چھڑ گئی، پہلے رکن الدین تخت پر بیٹھا، لیکن وہ اپنی ماں شاہ ترخان کے ساتھ جیل میں ڈال دیا گیا، رضیہ سلطانہ تخت پر بیٹھائی گئی، تو امراء کو اس کا ہوا خواہ ہو کر حکومت کو مضبوط بنانا چاہئے تھا، مگر لاہور اور سرہند کے حاکموں نے اس کے خلاف بغاوت کی، جب اس نے سرہند کے حاکم التونیہ سے کتیھل میں جنگ کی تو اس کے لشکریوں نے غداری کرکے اس کا ساتھ چھوڑ دیا، وہ شکست کھا گئی جس کے بعد وہ ہندوؤں کے ہاتھوں ہلاک کر دی گئی، جو اب تک ایک بڑا المیہ سمجھا جاتا ہے،

سلطان ناصر الدین محمود کے عہد میں ناگور، دوآب اور سمانہ کے حاکموں نے مرکزی حکومت سے بغاوت کرکے اس کو کمزور کیا، غیاث الدین بلبن نے وزارت عظمیٰ کی باگ ہاتھ میں لی تو ان غداروں کی سرکوبی اچھی طرح کی، جب وہ خود تخت نشین ہوا، تو اس نے ایک مرد آہن بن کر ملک میں امن قائم کیا، پھر بھی لکھنوتی کے حاکم طغرل نے اس کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، یہ علاقہ دہلی کی مرکزی حکومت کے لئے برابر درد سر رہا، بلبن اس سرکشی کو فرو کرنے کے لئے خود وہاں پہونچا طغرل کو شکست دے کر اس کے رشتہ داروں اور حامیوں کے سر قلم کرکے لکھنوتی کے بازار کے دونوں طرف سنگینوں میں لٹکا دیے، غداروں کی یہ عبرتناک سزا کئی روز تک جاری رہی،

بلبن کی مضبوط اور باوقار سلطنت اس کے کمزور جانشین کیقباد کے ہاتھوں سنبھل نہ سکی، خلجی امرا نے اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا، جس کے بعد جلال الدین خلجی دہلی کے تخت پر بیٹھا، وہ نیک دل اور بامروت حکمراں تھا، اس کے بھتیجے علاء الدین خلجی نے دیوگیر میں غیر معمولی فوجی کامیابی حاصل کی تو وہ خود تاج و تخت کا خواہاں ہوا، اس نے اپنے شفیق چچا کو غدارانہ طور پر قتل کرا دیا، اور بادشاہ بننے کی ہوس پوری کی، اور جب وہ اپنی دلیرانہ فتوحات سے سلطنت کا اثر بڑھا رہا تھا، تو اس کے بھتیجے اکت خان نے اس پر قاتلانہ حملہ کیا، گو ناکام رہا، اسی کے بعد دہلی کے کوتوال فخر الدین کے ایک غلام کے لڑکے حاجی مولیٰ نے ایک سید کو تخت پر بیٹھا کر علاء الدین کو بے دخل کرنے کی کوشش کی، مگر وہ سید کے ساتھ ہلاک کر دیا گیا،

علاء الدین خلجی کا بڑا معتمد فوجی سردار ملک کافور تھا، اس نے دکن میں فتوحات حاصل کرکے بڑی شہرت حاصل کی، اپنے شاہی آقا کی وفات کے بعد اس نے پہلے اس کے دو شہزادوں خضر خان اور شادی خان کو اندھا کیا اور ایک چھ سالہ شہزادہ کو تخت پر بیٹھا کر خود اس کا مالک بن بیٹھا، مگر اور دوسرے امراء نے اس غدار کو ہلاک کیا، اس کے بعد مبارک شاہ خلجی دہلی کا سلطان ہوا، اس نے

اپنے ایک نومسلم مصاحب خسرو خان پر پورا بھروسہ کیا، مگر اس نے غدارانہ طور پر اپنے مربی سلطان کو قتل کیا، اور خود بادشاہ بن گیا، مگر غیاث الدین تغلق نے ایک جنگ لڑ کر اس کو ہلاک کیا،

محمد بن تغلق کے عہد میں دہلی کی سلطنت کو بڑا عروج حاصل ہوا، اس کا وقار بیرونی ممالک میں بھی بڑھا، اسکی مزید ترقی میں تمام امراء کو حصہ لینا چاہئے تھا، مگر معبر کے حاکم جلال الدین نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا، بنگال حسب معمول پھوڑا بنا رہا، مشرقی بنگال کے حاکم بہرام خان کا اسلحہ بردار فخر الدین اپنے آقا کو قتل کر کے اس علاقہ کا مالک بن بیٹھا، لکھنوتی کے حاکم قدر خان نے اس کے خلاف لشکر کشی کی، تو لڑائی میں وہ بھی مارا گیا، اسکے بعد اس نے اپنی آزادی کا اعلان کر کے مرکزی حکومت کو نقصان پہونچایا، ظفر آباد کے حاکم عین الملک نے بھی بغاوت کر کے حکومت کو کمزور کیا،

فیروز شاہ تغلق نے اپنی سلطنت کا وقار قائم رکھا، لیکن اس کی کافی سرگرمیاں بنگال کے باغی حکمران حاجی الیاس کے خلاف لشکر کشی میں ضائع ہوتی رہیں، اس کی وفات کے بعد غدار امراء کی سازش سے جانشینی کی لڑائیاں یکے بعد دیگرے ہوتی رہیں، ان جانشینوں میں کوئی مارا گیا، کوئی جیل خانہ میں ڈال دیا گیا، کسی کے خلاف امراء کی بغاوت ہوئی، کسی کو زیر کرنے کے لئے کوئی حریف حکمران بنایا گیا، اسی انتشار پسندی میں امیر تیمور کا حملہ دہلی پر ہوا، وہ اپنے کو مسلمان کہتا تھا، لیکن مسلمانوں کی ایک سلطنت کو بڑی سفاکی، خونریزی اور غارتگری سے تباہ کیا، کیا اس نے اسلامی قدروں سے غداری نہیں کی؟ اس تباہی سے سازش پسند امراء کو سبق لینا چاہئے تھا، مگر افراتفری جاری رہی جس سے فائدہ اٹھا کر مالوہ، گجرات، جونپور اور دکن کے حاکموں نے دہلی سے اپنے کو آزاد کر لیا، ستم ظریفی یہ بھی ہوئی کہ دکن کے اندر بیجاپور اور گولکنڈہ اور بیدر کی حکومتیں علحدہ علحدہ بن گئیں،

جو علاقائی حکومتیں بنیں، ان کا حشر کیا ہوا، مالوہ کے حکمران غزنیں خاں کو اس کے وزیر محمود خاں نے زہر دیکر ہلاک کیا، اور خود وہاں کا سلطان بن بیٹھا، اسکے ایک اور حکمران غیاث الدین کو اسکے لڑکے نصیر الدین نے

زہر دیدیا، نصیر الدین کے جانشین محمود ثانی کو گجرات کے فرمانروا نے تہ تیغ کیا، اور مالوہ کو گجرات کا حصہ بنا لیا، گجرات کے حکمرانوں میں سکندر شاہ کا بھی قتل ہوا، اس کے بعد اس کا بھائی ناصر خان حکمران ہوا، تو بہادر شاہ اسکو معزول کر کے خود تخت نشین ہو گیا، مگر وہ خود پرتگالیوں کی سازش سے مارا گیا، اس کے بعد یہ سلطنت کمزور ہوتی چلی گئی، اکبر نے اپنے زمانہ میں اسکو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا، بنگال کے حکمرانوں میں علاء الدین فیروز شاہ کو اسکے چچا نے قتل کیا اور غیاث الدین محمود شاہ چہارم کے لقب سے تخت پر بیٹھ گیا، امراء کے اختلاف کی وجہ سے مغلوں کے عہد میں یہ حکومت بھی اکبر کے نذر ہو گئی ـ

خاندیش میں بھی امراء کی باہمی غداری کی وجہ سے بڑا انتشار رہا، اسکا ایک کمسن حکمران قتل ہوا، جس کے بعد گجرات کا حکمران محمود شاہ بیگڑہ یہاں اپنا نامزد فرمانروا تخت پر بٹھانے لگا، اکبر نے اسکو بھی اپنے زیر نگین کر لیا، دکن میں بہمنی خاندان کی حکومت کو بڑا عروج ہوا، وجیانگر جیسی طاقتور ہندو حکومت اسکے سامنے جھکتی رہی، مگر یہاں بھی باہمی آویزش غداری کی حد تک پہونچ گئی، اسکے حکمران مجاہد شاہ کو اسکے چچازاد بھائی داؤد نے قتل کیا، اس کا انتقام مجاہد کی بہن روح پرور آغا نے داؤد کو قتل کرا کے لیا، ایک دوسرے حکمران احمد شاہ نے اپنے بھائی کو قتل کر کے تخت حاصل کیا، اسی خاندان کا سلطان ہمایوں اپنے چھوٹے بھائی حسن کو معزول کر کے برسر اقتدار آیا، اور اس کو ایک خوفناک شیر کے منھ کے پاس ڈال دیا، جو اسکو چبا کر کھا گیا، بہمنی حکومت کا وزیر اعظم محمود گاواں بہت ہی نیک دل، فرشتہ صفت اور عظیم المرتبت سیاست داں تھا، دکنی امراء کی سازش سے اس کے شاہی آقا محمد شاہ ثالث نے اسکو قتل کرا دیا،

بہمنی حکومت امراء کے اختلاف سے کمزور ہوتی گئی، تو فوجی امراء میں عماد الملک نے برار، یوسف عادل شاہ نے بیجاپور، ملک احمد نے احمد نگر، قطب الملک نے گولکنڈہ اور قاسم بیدر نے بیدر میں آزاد حکومتیں قائم کر لیں، برار کی حکومت تو ۹۰ سال تک قائم رہ کر احمد نگر میں مل گئی، بیجاپور میں شیعہ سنی کے جھگڑوں سے برابر انتشار رہا، اسمٰعیل عادل شاہ کے زمانہ میں اس کے باپ کے ایک معتمد امیر کمال خان نے اس سے

غداری کی، اور ہمسایہ سلطنت سے مل کر تخت پر غاصبانہ قبضہ کرنا چاہتا تھا لیکن سلطان کی ماں نے اسکو قتل کرادیا، اسکے فرمانروا احمد نگر، بیدر اور گولکنڈہ کی حکومتوں سے برسرپیکار رہے، احمد نگر کے حکمران تو بیجاپور سے لڑنے میں وجیانگر کی ہندو ریاست سے بھی مدد لیتے رہے، یہ بھی امرار کی غدارانہ سازشوں سے روز بروز کمزور ہوتی گئی جو مغلوں کے عہد میں ان کی قلمرو کا جز بن گئی، گولکنڈہ کے قطب شاہی حکمرانوں میں سے قطب شاہ کو اس کے لڑکے نے قتل کیا، بیدر کی سلطنت کمزور ہوئی، تو اسکو عادل شاہیوں نے اپنے میں ضم کرلیا۔

دہلی میں تغلق خاندان کے خاتمہ کے بعد سیدوں کی حکومت قائم ہوئی، اس کا بانی خضر خان امیر تیمور سے مل گیا، اور اس کا باجگذار بن کر حکومت کرنے لگا، مگر غدار امرار کی سازشوں سے اس خاندان کے سلاطین کو چین نصیب نہیں ہوا، دوآب، بیانہ، کول، بدایوں، سامانہ اور گوالیار میں امرار کی سرکشی جاری رہی، ایک امیر سرورالملک نے اسکے فرمانروا سلطان مبارک کا قتل کرایا، انتشار پھیلا تو جونپور کے ابراہیم شاہ شرقی نے دہلی کی حکومت کے بہت سے علاقے غصب کرلئے، مالوہ کے حکمراں محمود خلجی کی بھی نظر دہلی کی طرف اٹھی، لاہور، اور سرہند کے حاکم بہلول لودی کی للچائی ہوئی نظر بھی دہلی پر پڑی، اسکے آخری فرمانروا علاء الدین عالم شاہ کا اختلاف اپنے وزیر حمید خاں سے بڑھا تو وزیر نے اپنے شاہی آقا سے غداری کرکے بہلول لودی کو دہلی کے تخت کا مالک بننے میں مدد پہونچائی۔

بہلول لودی تخت پر بیٹھا تو اس نے حمید خاں کو گوشۂ گمنامی میں زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ جو اپنے شاہی آقا سے غداری کرچکا ہے وہ اسکا وفادار نہیں ہوسکتا ہے، مگر بہلول لودی کے مخالفوں نے جونپور کے حکمراں محمود شاہ شرقی کو دہلی پر حملہ کرنے کی دعوت دی جس کی فوج میں کچھ افغان سردار بھی تھے، عین لڑائی کے موقع پر وہ غداری کرکے بہلول لودی کی فوج سے مل گئے، ان فوجی سرداروں کی غداریاں، دہلی اور جونپور کے دونوں مسلمان حکمران ایک عرصہ تک برسرپیکار رہے، جن سے دونوں کی حکومتیں کمزور ہوتی گئیں، بہلول لودی کے جانشین سکندر لودی کو اپنے بھائی بھتیجے سے لڑکر تخت حاصل

کرنا پڑا، خود سکندر لودی کو اپنے افغان فوجی سرداروں پر بھروسہ نہیں رہا، لوہانی، فرملی اور لودی قبیلے کے امرا ایک دوسرے پر اعتماد نہ کرتے، اور ڈرتے رہتے کہ معلوم نہیں کون کس وقت دھوکا دیدے،

اسی بے اعتمادی کی حالت میں ابراہیم لودی تخت پر بیٹھا تو اس نے اپنے بھائیوں کو جیل میں ڈالدیا، اپنے غدار فوجی امرار کو دبانے کی کوشش کی، تو ہر طرف بغاوت پھیل گئی، ایک گھمسان لڑائی میں بھائی بھائی، باپ بیٹے، اور دوست اپنے دوست سے لڑے، مسلمانوں کی گردنیں اس وقت شرم سے جھک گئی ہونگی کہ اسلام فصل کے بجائے وصل کی تعلیم دیتا ہے، مگر یہ نظر انداز ہوتی رہی، امرا کا اختلاف اتنا بڑھا کہ آخر میں دولت خاں لودی نے بابر کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی، وہ حملہ آور ہوا، اور ابراہیم لودی پانی پت کے میدان میں بابر سے لڑتا ہوا مارا گیا، جس کے بعد بابر نے ہندوستان میں ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالی، مگر اسکو افغانوں پر کوئی بھروسہ نہیں رہا، ان کو ہمیشہ شبہہ کی نظر سے دیکھتا، وہ ایک بہت ہی دل آویز حکمران ہوا، مگر تاریخ اسکو کیسے فراموش کرسکتی ہے کہ اس نے مسلمانوں کی لاشوں پر اپنی سلطنت کھڑی کی۔

ہندوستان کے مغل فرمانرواؤں کے دور میں جو غداریاں ہوتی رہیں، ان کا ذکر آئندہ اشاعت میں آئے گا، مذکورۂ بالا سطروں کو پڑھ کر ہمارے قارئین بددل ہوکر اپنے آپ سے شاید سوال کریں کہ کیا مسلمانوں کی تاریخ میں غدار ہی غدار پیدا ہوتے رہے، ایسا نہیں، ہماری تاریخ میں ہمارے اچھے حکمرانوں کی اکثریت رہی ہے، ان کی جہانگیری، جہانبانی اور جہانداری کی اعلیٰ سے اعلیٰ مثالیں بھی ملتی ہیں، مگر اس دور میں ضرورت اس کی ہے کہ ہم اپنے محاسن سے زیادہ اپنے نقائص پر نظر رکھیں، یہ صحیح ہے کہ دوسری قوموں میں بھی یہ سب کچھ ہوتا رہا ہے، اسی لیے گبن نے کہا ہے کہ تاریخ نوع انسانی کے جرائم اور مصائب کا ایک رجسٹر ہے، یورپ تو میکاولی کی اس تعلیم پر عمل ہی کر رہا ہے، کہ سیاست میں بداخلاقی کوئی چیز نہیں،

سیاسی مقصد کے حصول کے لیے حکمراں بد اخلاق بھی ہو سکتا ہے، اس کے لیے طاقت جھوٹ اور فریب کا استعمال کرنا ضروری ہوتا ہے، آدمی عموماً برے ہوتے ہیں، اس لئے ان کے ساتھ برا ہونا ناگزیر ہے، ہندوؤں کے ایک سیاسی فلسفی چانکیہ بھی اسی کا قائل رہا، قدیم ہندوستان کی تاریخ میں راجپوت راجاؤں کے یہاں بھی اس قسم کی مثالین ملتی ہیں، سرجدو ناتھ سرکار نے اپنی تاریخ فال آف دی موغل امپائر جلد اول میں لکھا ہے کہ ایک راجپوت جاگیر کی خاطر ہر قسم کے جرم کا ارتکاب کر لیتا، باپ بیٹے کو مار ڈالتا، بیٹا باپ کو قتل کر دیتا، شریف ترین خاندان کی عورتیں بہت ہی قابل اعتماد رشتہ داروں کو زہر دیدیتیں، راجہ اپنے وفادار وزیروں کی جان لے لیتا، رام دیوتا کی اعلیٰ ترین نسل سے پیدا ہونے والے راجپوت بھی ایک بیرونی ڈاکو کی مدد حاصل کرکے اپنے خانگی جھگڑوں کا فیصلہ کرا لیتے، (ج ۱ ص ۱۳۱)

———•———

مگر ان مثالوں سے ہم اپنے کو مطمئن نہیں کر سکتے، ہم میں اور دوسری قوموں میں فرق ہونا چاہئے، ہم کو خیر امت قرار دیا گیا ہے، ہم رحمۃ للعالمینؐ کے پیرو ہیں، ہم کو صفحۂ دہر سے باطل کو مٹانے کے لیے پیام دیا گیا ہے، نہ کہ ذاتی، نسلی قبائلی اور علاقائی مفاد کی خاطر اپنے حکمرانوں کو موت کے گھاٹ اتارنے اپنی غداری سے اپنے بھائیوں کا خون بہانے، بغاوت کرنے اور انتشار پھیلانے کو کہا گیا ہے، یہ اللہ اور رسولؐ کی تعلیمات سے سراسر غداری ہے،

———•———

کاغذ اور ہر چیز کی گرانی کی وجہ سے جنوری ۱۹۸۰ء سے معارف کا زر مبادلہ پندرہ سے بیس روپیہ سالانہ کر دیا گیا ہے، امید کہ اس کی ضخامت اور افادیت کے لحاظ سے یہ اضافہ ہمارے خریداروں کو گراں نہ گذرے گا،

مقالات

شیخ شیوخ العالم حضرت بابا فرید مسعود گنج شکرؒ

کے مجموعۂ ملفوظات اسرار الاولیاء کا مطالعہ

از جناب مولانا اخلاق حسین دہلوی

(۲)

استاد محترم | اسرار الاولیاء ہی سے ہماری معلومات میں یہ اضافہ ہوتا ہے کہ حضرت باباصاحبؒ کے ایک استاد محترم کا نام نامی مولانا بہاء الدین بخاری تھا، آپنے فرمایا،

"اے درویش وقتے از زبان استاد خود شنیدم مولانا بہاء الدین بخاری رحمۃ اللہ علیہ که وقتے خواجہ تمیم انصاری رحمۃ اللہ علیہ بر دست حبشیان گرفتار شدہ بود" (اسرار الاولیاء، ص ۳۰)

ایک دفعہ یہ بھی ذکر فرمایا۔

"اے درویش از شیخ بہاء الدین بخاریؒ که یکے از واصلان حق بود این قطعہ از دیاد دارم اما از شوق گفتہ بود۔

من اول روز چوں در تو بدیدم شیفتہ گشتم　ندانستم تو بودے یا کہ بودست این کہ من دیدم
چناں در روئے آں جانان شدم من شیفتہ والہ　کہ من از خود شدم بیروں ترا در جان و تن دیدم

الغرض ان امتیازات سے اسرار الاولیاء کی انفرادیت واضح ہے، اسرار الاولیاء کے مطالعہ سے

معلومات میں وہ اضافہ ہوتا ہے، جو دیگر کتب ملفوظات کے مطالعہ سے نہیں ہوتا۔

اسرار الاولیاء کی ضخامت

اسرار الاولیاء کے فارسی مطبوعہ نسخے کا حجم ۹۴ صفحات ہے، مولانا بدرالدین اسحاق نے یہ بھی وضاحت فرمائی ہے، کہ انھوں نے یہ صحیفۂ رشد وہدایت بارہ[۱۲] سال مین مرتب فرمایا ہے، اس بیان کے صحیح ہونے میں شک وشبہ کی گنجایش نہیں، حضرت محبوب الٰہیؒ کا ارشاد ہے،

مولانا بدرالدین اسحاقؒ چناں خادمی شیخ الشیوخ العالم قدس اللہ سرہٗ العزیز کردے کہ از دہ تن چنان خدمت نیامد باآں ہمہ مستغرق ومشغول حق بودے تا حدے کہ بخدمت شیخ شیوخ العالم نشستہ مستغرق حق تعالیٰ بودے کہ از خود خبر نہ داشتے،

(سیر الاولیاء، ص ۱۷۷ چ)

مولانا بدرالدین اسحاقؒ حضرت بابا صاحبؒ کی ایسی خدمت کرتے تھے جو دس[۱۰] آدمی بھی نہیں کر سکتے تھے (اس مشغولی کے باوجود) نہایت مستغرق اور یاد حق میں محو رہتے تھے، حتیٰ کہ جب حضرت بابا صاحبؒ کی خدمت میں بیٹھے ہوتے تو بھی ہمہ تن یاد الٰہی میں محو رہتے تھے، اپنا بھی ہوش نہ رہتا تھا،

حضرت محبوب الٰہی نے یہ بھی فرمایا ہے۔

وقتے مولانا بدرالدین اسحاقؒ کہ تعویذ او نوشتے حاضر نہ بود، وخلقے بجہت تعویذ بردن آمدہ بودند، مرا اشارت کرد کہ تو بنویس من تعویذ نوشتم تا خلق انبوہ شد کتابت من بسیار شد ومزاحمت خلق بیشتر شد، درین میان شیخ روئے سوئے من کرد وفرمود کہ ملول شدی،

ایک دفعہ مولانا بدرالدین اسحاقؒ موجود نہ تھے جو حضرت بابا صاحبؒ کے حکم سے تعویذ لکھا کرتے تھے، تعویذ لینے والے آئے ہوئے تھے، حضرت بابا صاحبؒ نے مجھ سے فرمایا کہ تم لکھو، مین نے تعویذ لکھے تعویذ لینے والے بہت ہی آ جمع ہو گئے، مجھے بہت ہی لکھنا پڑا، مخلوق کے ہجوم سے کام میں رکاوٹ بھی ہوتی تھی، حضرت بابا صاحبؒ نے میری طرف رخ کیا اور فرمایا (کیا) تھک گئے، میں نے عرض کیا آپ پر سب کچھ روشن ہے،

من گفتم کہ وقت شیخ حاضر است

(فوائد الفواد، ص ۲۰۰)

حضرت محبوب الٰہیؒ کے بیان سے واضح ہے کہ مولانا بدرالدین اسحاقؒ کو بھی ہجوم خلائق سے دوچار رہنا پڑتا تھا، جس مین خاصا وقت صرف ہوتا تھا، اس انہماک ومشغولیت کے باوجود دیگر امور بھی ان کے سپرد تھے، مہمانوں کی تواضع اور خدمت، لنگر خانے کا انتظام واہتمام بھی ان ہی کے سپرد تھا، حتیٰ کہ لنگر خانے کے لیے جنگل سے لکڑیان بھی لاتے تھے۔ (سیر الاولیاء ص ۱۷۷) پھر جو شخص اس قدر منہمک اور مشغول بکار ہو اور جس کے لیے حضرت بابا صاحبؒ کی خدمت مقدم ہو اور خدمت بھی ایسی کہ اس سے دس آدمی بھی عہدہ برآنہ ہو سکین اور ہمہ وقت مشغول بھی رہتا ہو، اس سے کتنی ضخیم کتاب کی تدوین متوقع ہو سکتی ہے، لہذا جو کچھ بھی کیا وہ ان ہی کا کام تھا، جو انھوں نے کیا، دوسرا کوئی عہدہ برآنہ ہو سکتا تھا،

واقعات شاہد ہیں کہ یہ مجموعۂ ملفوظات اسرار الاولیاء مولانا بدرالدین اسحاقؒ ہی کے رشحات قلم کا ثمرہ ہے جو دست برد زمانہ سے ہم تک محفوظ نہیں پہنچا ہے، لیکن جو کچھ ہے، عقیدت مندوں کے لئے سرمۂ چشم اور سالکانِ راہ سلوک کے لیے خضر راہ ہے،

کتابوں کے حوالے

حضرت بابا صاحبؒ کا مطالعہ وسیع اور حافظہ نہایت قوی تھا، آپ کو یہ یاد رہتا تھا کہ کس مضمون کا ماخذ کیا ہے، لہذا آپ گاہ بگاہ طالبوں کی رہنمائی کے پیش نظر جزوی یا کلی طور پر ماخذات کا ذکر بھی فرماتے رہتے تھے، یہ روش ملفوظات میں عام ہے، عموماً ہر مجموعۂ ملفوظات مین ملتی ہے، اسرار الاولیاء میں بھی متعدد ماخذات کا ذکر ہے مثلاً

(۱) قاضی حمید الدین ناگوری رحمۃ اللہ علیہ در تواریخ خود نبشتہ است (ص ۴-۱۳) (۲) خواجہ معین الدین سنجری جائے نبشتہ است (ص ۵) (۳) در زاد المجبین نبشتہ دیدہ ام (ص۸) (۴) خواجہ امام محمد طاہر غزالی در تواریخ خود نبشتہ است (ص ۱۳) (۵) در آثار الاولیار نبشتہ دیدہ ام (ص ۱۵) (۶) شیخ الاسلام شہاب الدین قدس اللہ سرہٗ العزیز فرمودہ است (ص ۴۷) (۷) در سلوک نبشتہ دیدہ ام (ص ۴۴، ۴۳، (سلوک سے مراد کتاب سلوک الاولیار) (۸) در عہد خواجہ جنید بغدادی قدس اللہ روحہ دیدہ ام (ص ۴۷، ۴۸) (۹) در اسرار العارفین نبشتہ دیدہ ام (ص ۵۰) (۱۰) در کتاب محبت نبشتہ دیدہ ام (ص ۵۱-۵۳) (۱۱) در حجۃ العارفین آمدہ است (ص ۵۲) (۱۲) خواجہ عبد اللہ سہیل تستری رحمۃ اللہ علیہ جائے نبشتہ است (ص ۶۶) (۱۳) در سلوک الاولیار نبشتہ دیدہ ام (ص ۶۷) (۱۴) از زبان شیخ اوحد الدین کرمانیؒ شنیدہ ام (ص ۶۹) (۱۵) شنیدم از زبان خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہٗ العزیز (ص ۷۳)

تلاش و تفحص سے کچھ حوالے اور بھی ملتے ہیں، ماخذات کی یہ تعداد نہایت قلیل ہے، آٹھ ۸ سات ۷ کتابوں کے نام ہیں، دیگر حوالہ جات کا تعلق ذاتی معلومات اور ذاتی مطالعہ سے ہے، حوالہ جات کا یہی عالم دیگر کتب ملفوظات میں ہے، خیر المجالس میں اکتیس ۳۱ تو مستقل کتابوں کے نام ہیں اور متعدد حوالے ذاتی معلومات پر مبنی ہیں، خیر المجالس میں ماخذات کا ذکر کچھ اس طرح ہے۔

(۱) در کشاف نوشتہ است (ص ۸۳) (۲) در کتابے نوشتہ است (ص ۶۲) (۳) حجۃ الاسلام غزالی حکایت بزرگے نوشتہ است (ص ۹۵) (۴) عین القضاۃ در کتاب خود نوشتہ است (ص ۹۶) (۵) قول بزرگے فرمودند (ص ۱۵۵) (۶) در عوارف است (ص ۱۵۵) (۷) از بزرگے روایت فرمودند (ص ۱۵۳) (۸) در رسالہ نبشتہ دیدہ ام (ص ۲۳۵) (۹) در فلاں کتاب نوشتہ است (ص ۲۳۹) (۱۰) در کتابے دیدہ ام (ص ۲۵۰)

متقدمین کی اکثر و بیشتر کتابیں نایاب و ناپید ہیں، بعض کا پتہ نشان کشف الظنون (چلپی) کی سی کتبِ حوالہ جات سے مل سکتا ہے، لیکن کتب حوالہ جات بھی جزو کل پر حاوی نہیں ہوتیں، حال ہی میں پنجاب یونیورسٹی لاہور (پاکستان) سے "تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند" نام سے کئی جلدیں شائع ہوئی ہیں، لیکن متعدد کتابوں کا ذکر رہ گیا ہے، جن کی طرف ماہنامہ معارف اعظم گڑھ (جنوری و فروری ۱۹۵۰ء) میں توجہ دلائی گئی ہے، اس کا مدعا یہ ہے کہ اگر بعض کتابوں کا ذکر نہیں ملتا تو یہ بدگمانی نہیں کی جاسکتی کہ یہ کتابیں جعلی و فرضی ہیں، اولیار اللہ سے متعلق کتابوں کے باب میں تو یہ بدگمانی نہایت درجہ مکروہ ہے۔ اِنَّ بعض الظَّنِ اِثمٌ۔ بدگمانی کا مرتکب وہی ہوگا، جو علمی قدروں سے نابلد ہوگا۔

الغرض اسرار الاولیار میں ماخذات کے جو حوالے ملتے ہیں وہ خیر المجالس کے حوالوں سے زیادہ وقیع اور معتبر انداز میں ملتے ہیں، ان کے باب میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں، تقریر و بیان میں حوالہ جات کی یہی روش ہے، جو آج بھی ہے۔

اسفار و مشاہدات کتب ملفوظات کا مطالعہ شاہد ہے کہ اولیار اللہ کا یہ بھی معمول رہا ہے کہ وہ ملفوظات میں برمحل اپنے اسفار و مشاہدات کا ذکر فرماتے رہے ہیں۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کے اسفار نہایت قلیل ہیں، بدایوں سے دہلی اور دہلی سے اجودھن (پاکپٹن)، مگر آپ نے ان مختصر اسفار و مشاہدات کا بھی ذکر خیر فرمایا ہے، جو فوائد الفواد اور سیر الاولیار کے اوراق کی زینت ہے، یہ صورت حال اس کی دلالت کرتی ہے کہ یہ بھی حضرت باباصاحبؒ کے اسفار و مشاہدات کی اور دیگر مشائخ عظام ہی کی اتباع ہے۔

حضرت باباصاحبؒ کے اسفار و مشاہدات کا ذکر اسرار الاولیار میں بھی ہے، اور راحت القلوب میں بھی ہے، ممکن ہے کہ حضرت باباصاحبؒ کے ملفوظات کے ان مجموعات میں بھی ہو، جو

اب نایاب ہیں، فوائد الفواد میں بیشک حضرت باباصاحبؒ کے ان سفروں اور مشاہدوں کے ذکر کو دہرایا نہیں گیا ہے، جن کا تعلق دیگر ممالک سے ہے، فوائد الفواد نہ تو حضرت باباصاحبؒ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے، نہ حضرت باباصاحبؒ کی سوانح حیات ہے، نہ وہ کوئی انسائیکلوپیڈیا ہی ہے، کہ اس میں وہ کچھ ہوتا، جو عمومی کتابوں میں نہیں ہوا کرتا۔ البتہ وہ صحیفۂ رشد وہدایت ہے طالبانِ سلوک کے لیے، مگر کیا اس میں سلوک سے متعلق سب ہی کچھ ہے، پھر اگر حضرت باباصاحبؒ کے اسفار ومشاہدات کا ذکر نہیں ہے تو وہ نفی اسفار کی دلیل کیسے ہو سکتی ہے، لزوم مالا یلزم بے معنی سی بات ہے،

حضرت باباصاحبؒ کے جن سفروں کا ذکر اسرار الاولیاء کے اوراق کی زینت ہے وہ یہ ہیں،

ملک بالا (مقام سوتہ)، بغداد، غزنی، طرف شام، بدخشاں، سیوستان، بدایوں، لاہور،

ان کے علاوہ بھی دیگر معتبر ماخذات میں دیگر سفروں کا ذکر ملتا ہے، مثلاً

اجمیر، دہلی، ہانسی، ملتان، اُچ، فرید کوٹ، علاقۂ سہارن پور، مارواڑ، بخارا، اور قندھار . . . . .

عہد وسطیٰ میں سیاحت مشائخ عظام کا خصوصی مشغلہ تھا، خواجہ عثمان ہارونیؒ، خواجۂ بزرگ خواجہ معین الدین سجزیؒ، خواجہ قطب الدین بختیار اوشیؒ، قاضی حمید الدین ناگوریؒ، شیخ جلال الدین تبریزیؒ، شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ، شیخ سعدی شیرازیؒ متواتر حرکت میں رہے ہیں، اور اس پُر آشوب زمانے میں بھی عزلت گزین نہ ہوئے اس باب میں حضرت باباصاحبؒ بھی ان ہی بزرگوں کے ہم ردیف رہے، اور سیر وسیاحت کے فوائد سے مستفید ہوئے۔

تاریخی وقائع | ہر کتاب کا ایک موضوع اور نصب العین ہوتا ہے، اور وہ اس علم وفن سے متعلق ہوتا ہے،

جس سے وہ متعلق ہوتی ہے، اگر ضمناً دیگر علوم وفنون سے متعلق کچھ شامل ہو جائے اور وہ مربوط بھی ہو جائے تو کچھ مضائقہ نہیں، ایسا خال خال ہی ہوتا ہے، ورنہ ہر کتاب اپنے فن سے متعلق رہتی ہے، فلسفہ، منطق، ریاضی، سائنس، دینیات، تصوف، ان علوم سے متعلق جو کتابیں ہوں گی، ان میں تاریخی وقائع کی تلاش بے سود اور لاحاصل ہے، کتب ملفوظات کی نوعیت بھی یہی ہے، کہ اذہان دنیاوی زرق برق وبرق میں مبتلا نہ ہوں، چنانچہ فوائد الفوائد، اور خیر المجالس میں بھی ان کے عہد تالیف کے تاریخی وقائع نہیں ملتے، لیکن یہ عجوبۂ روزگار ہے، اسرار الاولیاء میں مختصر سہی دو تاریخی وقائع ملتے ہیں

(۱) سلطان ناصر الدین محمود کا سفر ملتان (۶۵۵ھ) ص ۸۲ (۲) اُچ پر مغلوں کی یورش اور والیٔ ملتان شیر خان کا مارا جانا (۶۶۲ھ) ص ۶۹

اس اعتبار سے بھی اسرار الاولیاء کو دیگر کتب ملفوظات پر فوقیت حاصل ہے۔

داخلی کیفیات | اسرار الاولیاء اگرچہ دستبرد زمانہ سے محفوظ نہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت باباصاحبؒ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے، صدہا سال گزرنے کے باوجود آج بھی اس میں وہ کیفیت اور دلآویزی ہے، جو بیان میں سما نہیں سکتی، بار بار پڑھنے سے کیفیت میں متواتر اضافہ ہوتا رہتا ہے، ذرا بھی کمی نہیں آتی، پڑھنے والا نئی سے نئی کیفیت سے لطف اندوز ہوتا رہتا ہے، کبھی کسی بیان سے اور کبھی کسی بیان سے پڑھنے والے پر لگاتار کچھ ایسی کیفیت طاری ہوتی رہتی ہے، کہ وہ اپنے کو ہر بار کسی اور ہی عالم میں پاتا ہے، محسوس کرتا ہے، کیف وذوق سے طبیعت ایسی متکیف رہتی ہے کہ گویا وہ نغمۂ الست میں کھو سا گیا ہے، اور کوثر وتسنیم کی موجوں سے کھیلنے سا لگا ہے، کیف وسرور کے عالم میں مدہوش وبے خبر ہے، اور اسی عالم میں رہنا چاہتا ہے، کبھی عالم سرور وبیخودی میں گنگنانے لگتا ہے۔ ؎

مومن آلائش محبت میں کہ سب کچھ ہے روا
حسرت حرمت بادۂ دمز امیر نہ کھینچ

ضرورت حاضرہ کے پیش نظر میں نے اسرار الاولیاء کا از سر نو مطالعہ کیا، کیا بتاؤں میں نے

کیا پایا، کہیں مقام ایسے آئے کہ روح میں اہتزاز پیدا ہو گیا، جی بھر آیا، آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے، حسرت و حیرت طاری ہو گئی، دل دنیا سے بیزار ہو اور ہی چاہنے لگا، سب سے حیرت انگیز یہ کہ یہ بھی پتہ نہ چلا کہ یہ کیف و سرور، یہ سرمستی کس لفظ کس جملے یا کس عبارت سے حاصل ہوئی ہے، کہہ لیجیے کہ تدریجی طور سے جو کیفیت فراہم ہوتی رہی ہے جب پیمانہ لبریز ہو گیا تو چھلک پڑا ہے،

بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسرار الاولیار از اول تا آخر کیف و مستی، شریعت و طریقت، ادب و زبان، نور و عرفان اور صداقت و دلربائی کا بیمثل مرقع ہے دیرینہ روزی کے اثرات سے متاثر ہونے کے باوجود تاثیر کا نشتر رگ جان میں پیوست ہوتا ہی چلا جاتا ہے، اگرچہ وہ زبان حال سے عقیدت مندوں کی سرد مہری اور بے اعتنائی کی نوحہ خوان بھی ہے کہ وہ صحت و مقابلہ سے مزین ہو کر منظر عام پر نہ آسکی، جس کی اشد ضرورت ہے،

عرفار کاملین رشد و ہدایت کو بڑی اہمیت دیتے ہیں اور وہ اس باب میں ضعیف سے ضعیف حدیث کو بھی روا رکھتے ہیں، اور اس سے کام لینے میں تکلف نہیں برتتے، وہ طبیب روحانی ہوتے ہیں، حاذق اطبار سے بھی اس باب میں ان کا مقام بلند ہے، وہ دل کی نبض پر انگلی رکھتے ہیں، اور تشخیص و تجویز کرتے ہیں، اور تدبیر فرماتے ہیں، جس طرح حاذق اطبار کو ان ادویہ سے کام لینے کا استحقاق ہے، جو عام حالات میں شرعاً ممنوع اور حرام و ناروا ہیں اسی طرح عرفا بھی بوقت ضرورت ان تدابیر کو اپنا لیتے ہیں، جنھیں علمائے شریعت وقیع نہیں جانتے اور ان سے اجتناب برتتے ہیں۔

خوارق عادات اور محیر العقول نقلیں اور تمثیلیں بالطبع انسان کو مرغوب ہیں، عرفائے کاملین نے ان سے بھی کام لیا ہے انوار سہیلی (کلیلہ و دمنہ و پنجتنتر)، منطق الطیر اور مثنوی معنوی تمثیلی بیان کے شاہکار ہیں، جن کی حکایتوں اور تمثیلوں سے اہم اخلاقی نتائج برآمد ہوتے ہیں، جن سے دل و دماغ کی کایا پلٹ جاتی ہے، حیرت انگیزی کا وصف دلوں کو موہ لیتا ہے، اور آمادۂ عمل بنا دیتا ہے،

اسرار الاولیار اس وصف سے خالی نہیں، اگر اس کو اسرار متحیرین سے تعبیر کیا جائے تو بے جا نہ ہو گا، اور اسرار الاولیار ہی کیا عہد وسطی کا جملہ ادب مشرقی ہو یا مغربی اس وصف سے مالامال ہے، اگر اسرار الاولیار میں یہ وصف نہ ہوتا تو نگاہ تحقیق میں یہ اس کا وصف نہ ہوتا سقم ہوتا۔

یہ صحیح نہیں کہ محیر العقول واقعات سے ناممکنات کے یقین کا نقش جمانا مقصود ہوتا ہے، بلکہ مقصود ہوتا ہے اس کا اثر و نتیجہ[1]، اور در اصل اسلوب کی جاذبیت اور کشش مراد ہوتی ہے، بہر نوع دیرینہ روزی کے اثرات سے متاثر اور دستبرد زمانہ کے اثرات سے دو چار رہنے کے باوجود مجموعۂ ملفوظات اسرار الاولیار خوبیوں سے مالامال اور لائق مطالعہ و استفادہ ہے، البتہ ضرورت ہے کہ صحت و مقابلہ سے آراستہ کر کے اسے منظر عام پر لایا جائے تاکہ معاشرہ میں ایمانی تنوع رونما ہو، اور حقیقی راہنمائی حاصل ہو سکے،

۱۷- اسلوب بیان اسرار الاولیار کا اسلوب بیان اگرچہ سادہ، سلیس اور عام فہم ہے، مگر نہ ایسا سادہ سپاٹ اور بے آب و رنگ کہ مطالعہ سے اکتائے اور جی پیدا ہو اور نہ ایسا رنگین و دقیق اور مسجع و مقفیٰ کہ اس پر مصنوعی ہونے کا اطلاق ہو سکے، اور جس سے خاص و عام لطف اندوز نہ ہو سکیں، اسرار الاولیار بلکہ جملہ ملفوظات کے مجموعات کا یہ عمومی وصف ہے کہ ہر طبقہ کا فارسی دان مفہوم و مضمون کو بآسانی سمجھ لیتا ہے، اور اپنی استعداد کے مطابق استفادہ کر لیتا ہے، تصوف کے دقیق اور نازک مسائل کو اس خوبی سے بیان کرنا زبان دانی کا اور اسلوب بیان کا ایسا وصف ہے جو ہر تعریف و توصیف سے بالاتر ہے،

اس وصف کا تعلق جامع سے بھی ہے، اور صاحب ملفوظ سے بھی، جامع کتنے ہی فاضل سہی لیکن راہ سلوک میں وہ مبتدی ہوتے ہیں، اگر شیخ کا اسلوب کمالیت سے مالامال نہ ہو تو وہ یقیناً عہدہ برآ

[1] ماہنامہ معارف اعظم گڈھ، اگست ۱۹۴۹ء ص ۱۰۰،

برانہ ہوں۔ گویا کہ اسرار الاولیاء کا اسلوب دراصل پرتو ہے حضرت باباصاحبؒ کے اسلوب کا۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کا ارشاد ہے۔

باربا در ذوق بیان ایشان مردم چناں فردی شد	اکثر ایسا ہوا کہ سامعین آپکے (حضرت باباصاحبؒ کے) بیان
کہ تنا بردہ شدے اگر ہمیں زماں مردم بمیرد نیکو باشد	کے کیف میں کھو سے گئے ہیں اور آرزو کرنے لگے ہیں کہ
(فوائد الفواد، ص ۵)	اسی کیف میں مرجائیں تو اچھا ہو۔

حضرت خواجہ غلام فرید چشتیؒ (متوفی ۱۳۱۹ھ / ۱۹۰۱ء) کا ارشاد ہے۔

"شیخ بدر الدین اسحاق قدس سرہٗ جو اسرار الاولیاء کے جامع ہیں ان کا ضبط الفاظ اس قدر پختہ ہے کہ جو کچھ انھوں نے شیخ شیوخؒ کی زبان درفشان سے سنا اسی طرح لکھ دیا اختلاف کی کوئی گنجایش نہیں ہے"، (مقابیس المجالس، ص ۳۶۵ - ۳۶۶ ترجمہ)

یہ ان بزرگ کا بیان ہے، جو علم و فضل اور بصیرت باطنی سے مالامال اور درویشانہ و عالمانہ شخصیت کے جامع تھے،" ان کے بیان کے بعد اسرار الاولیاء کے اسلوب بیان سے متعلق لب کشائی کی گنجایش نہیں رہتی، گویا کہ اسرار الاولیاء کا اسلوب بیان ہر اعتبار سے جامع اور بے مثل ہے،

نفس مضمون اسرار الاولیاء جن جواہر پاروں کا خزینہ ہے، ان میں سے معدودے چند پیش کیے جاتے ہیں تاکہ نفس مضمون سے آگاہی حاصل ہو سکے اور اسرار الاولیاء کی اہمیت واضح ہو جائے، فرمایا ہے،

(۱) اے درویش جو بادۂ محبت سے سرشار ہے وہی عرفا کے کلام کا قدردان ہے۔ وہی جانتا اور سمجھتا ہے۔ (۵)

(۲) اے درویش کلام معرفت کی قدر و منزلت سے وہی آگاہ ہے، جس کے دل میں انوار عشق اور اسرار دوست نے گھر کر لیا ہے، (۵)

ورنہ حقیقت یہ ہے، ؎

اے کہ آگاہ نۂ عالم درویشاں را	تو چہ دانی کہ چہ سود ابو سراست ایشاں را

(۳) اے درویش فقرا اہل عشق ہیں اور علما اہل عقل ــــــــــــ اور درویش کا عشق علماء کی عقل پر غالب ہے

(۴) اے درویش مردان خدا نے یہی کیا ہے کہ وہ جس کسی درماندہ اور محتاج کے پاس سے گزرے اسی کو نعمت دارین سے مالامال کر دیا ہے۔ (۶)

یہ فیض رسانی انسانی ہمدردی کے وصف کا ثمرہ ہے، جواب ناپید ہے،

(۵) اے درویش جس دل میں محبت گھر کر لیتی ہے، اس میں محبوب کے سوا اور کسی شے کے سمانے کی گنجایش نہیں رہتی ....

وصال محبوب سے باریاب وہی ہوتا ہے، جو دوئی کے عیب سے محفوظ و مبرا ہو گیا ہے، پھر شرک و کفر کی گنجایش کہاں، عیب جوئی اور خوردہ گیری کا گزر کہاں، (۱۷-۱۸)

(۶) اے درویش عشق و محبت کی آگ درویش ہی کے دل میں سلگتی ہے، اس کی جلوہ آرائی کے لیے اور کوئی محل و مقام نہیں ہے، (۷)

سماع سے یہ آگ بھڑک اٹھتی ہے، حضرت باباصاحبؒ کا ارشاد ہے، السماع یحرک قلوب المستمعین ویوقد نار الشوق فی صدور المشتاقین[1] (سیر الاولیاء ص ۴۹۲)

(۷) اے درویش اس عالم آب و گل سے جو کوئی ایمان سلامت لے گیا یہ یقین جانو اس نے بڑا کام کیا، پالا مار لیا،

سلامتی ایمان کا تو یہاں احساس تک نہیں، اللہ ہی انجام بخیر فرمائیں تو فرمائیں،

(۸) جب کسی درویش پر کیفیت طاری ہوتی ہے، تو از عرش تا فرش بلکہ تحت الثریٰ

---

[1] [illegible] دلوں کو حرکت میں لاتا ہے، اور مشتاقوں کے دل میں شوق کی آگ کو بھڑکاتا ہے،

تک کوئی شے اس سے چھپی نہیں رہتی، (۱۳)

یہ کیفیت فضل الٰہی پر منحصر ہے، یہ بڑا نازک مرحلہ ہے، اچھے اچھوں کے قدم ڈگمگا گئے ہیں، عالمِ تحیر میں بسا اوقات اسی کیفیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

(۹) دنیا طلبی مسلمانوں کو راس نہیں، مسلمانوں میں جو بھی طالبِ دنیا ہوگا وہ محروم ہی رہے گا، دنیا پاس بھی نہیں پھٹکے گی،

بڑے گر کی بات ہے، معاشرہ کے نقص کی نشان دہی ہے، طلبِ دنیا کیا ہے، حق سے بے خبری اور روگردانی۔ ع

چیست دنیا، از خدا غافل بودن

(۱۰) اے درویش دنیا میں کوئی شے صدقے سے بہتر اور سخاوت سے افضل نہیں ہے، جس نے بھی کچھ پایا ہے، سخاوت ہی کی بدولت پایا ہے،

ایثار و قربانی کی ترغیب و تحریص ہے، درویش اسی پر عامل ہوتے ہیں، سعدی علیہ الرحمۃ کا ارشاد ہے۔ ع

نیم نانے گر خورد مردِ خدا بذلِ درویشان کند نیم دگر

درویشی میں حاتم کا سا دل درکار ہے، قارون کی سی تنگ دلی مطلوب نہیں، آج کے درویش کیا طمعِ زر اور حبِ جاہ میں مبتلا نہیں ہیں،

(۱۱) نزولِ رحمت کے تین وقت ہیں،

(۱) سماع کے دوران اہلِ سماع پر، اور ان کے یار و انصار پر نزولِ رحمت ہوتا ہے،

(۲) اولیاء اللہ کے ذکر کے دوران ہر کا شخص پر نزولِ رحمت ہوتا ہے،

(۳) اہلِ دل جب انوار و تجلیات کے عالم میں مستغرق ہوتے ہیں تو ان پر نزولِ رحمت ہوتا ہے،

سماع فی نفسہ مباح ہے، اس کی حرمت نصِ قطعی سے ثابت نہیں، جو سماع صوفیۂ کرام کے ہاں مروج تھا، وہ اب نایاب ہے قوالی جس کا رواج آج کل ہے، وہ سماع نہیں، سماع کی مسخ شدہ شکل ہے، موجودہ قوالی کو سماع سے تعبیر کرنا اور اس کے پردے میں سماع کو حرام بتانا صحیح نہیں ہے، اسی طرح مروجہ قوالی کو سماع سے تعبیر کرنا اور روا جاننا بھی صحیح نہیں ہے ؎

جنکو نہیں شعورِ زیست ان کو یہ کتنا ہو روا حسن بلائے چشم ہے نغمہ وبالِ گوش ہے

(۱۲) اے درویش یادِ الٰہی میں ہمہ تن مشغول رہنا چاہیے، بمصداق دل بیار و دست بکار، ہر ہر کام اللہ کی رضا کے مطابق ہونا چاہیے، دیکھنا پھر تم کیسی کیسی نعمتوں سے نوازے جاتے ہو،

خداوند عالم عمل صالح کی توفیق عنایت فرمائیں، یہی خلاصہ ہے، اسلامی تعلیمات کا۔

(۱۳) اے درویش مولیٰ اور بندے میں جو دوری ہے اور درمیان میں جو پردے حائل ہیں، وہ آلائشِ دل کا سبب ہیں، دل دنیاوی دھندوں میں الجھا ہوا ہے، اگر آلائش دل دور ہو جائے تو جو پردے حائل ہیں اٹھ جائیں گے، وصف مکاشفہ اور مقام مشاہدہ حاصل ہو جائے گا، جو بہت بڑی نعمت ہے، توبۃ النصوح سے یہ پردے مرتفع ہو سکتے ہیں،

توبۃ النصوح کی تلقین اور خدا رسی کی تعلیم ہے، جو انسانیت کا اعلیٰ وصف ہے، خدائے پاک توفیق نصیب فرمائیں،

جب صبح ہوتی ہے تو جسمِ انسانی کے ساتوں حصے زبان سے پناہ مانگتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اے زبان اگر تو نے اپنے کو قابو میں رکھا تو ہم ہلاکت سے محفوظ رہیں گے، ورنہ تباہ و برباد ہو جائیں گے، اے زبان ہمارے حال پر رحم کر اور اپنے کو قابو میں رکھ تاکہ ہم ہلاکت سے محفوظ رہیں۔

ہفت اندام (۱) سر (۲) سینہ (۳) پیٹھ (۴، ۵) دونوں ہاتھ (۶، ۷) دونوں پیر۔ بعض نے
دل، دماغ، کلیجہ، تلی، پھیپھڑا، پتہ، معدہ، یا گردہ قرار دیے ہیں لیکن ان کا تعلق دراصل علم طب سے ہے،
عمومی طور پر ہفت اندام سے مراد پہلے ہی سات عضو انسانی ہیں،
خواجہ حالی کی زبان گویا کا ماخذ یہی حکایت ہے، دیکھئے اہل کمال برادران وطن کی ضیافت
کے لیے کہاں کہاں سے خوشہ چینی کرتے اور دسترخوان سجاتے ہیں ؎

تمتع زہر گوشہ یافتم   زہر خرمنے خوشہ یافتم

(۱۵) زبان کی آفت و بلا سے محفوظ رہنے کی ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ جو کوئی اس آفت سے
محفوظ رہنا چاہے، وہ تازہ دم وضو کرے، دو رکعت نماز نفل پڑھے پھر قبلہ رو بیٹھ کر جناب
باری میں عرض کرے الٰہ العٰلمین! میری زبان کو بدگوئی سے محفوظ رہنے کی توفیق
نصیب فرمائیے اور یہ وصف عنایت فرمائیے کہ ذکر الٰہی کے سوا کوئی ذکر زبان پر نہ آئے
اور ان باتوں سے میری زبان کو اپنی پناہ میں رکھیے جو آپ کی رضا کے خلاف ہیں، (۲۳)
سمجھے یہ کیا ہے، معاشرے ہی کی عکاسی ہے، غیبت و بدگوئی کی بدولت جنگ و پیکار کا جو بازار گرم تھا
یہ اسی کا سدباب ہے، اسرار الاولیار میں قدم قدم پر سماجی اور تہذیبی زندگی کا نہ صرف سراغ ملتا ہے،
بلکہ سماجی خرابیوں کی اصلاح کی تدابیر بھی ملتی ہیں، مگر دیکھنے کے لیے دیدۂ بینا درکار ہے، ؏

بے بصیرت یہ راز کیا جانے۔

(۱۶) اے درویش نکوکاری کا راز سربستہ یہی ہے کہ انسان اپنی نفسانی خواہشات
کو قابو میں رکھے، طبیعت کے تقاضوں سے کنارہ کش رہے، اور دنیاوی لذتوں
میں مبتلا نہ ہو،
یہ بھی دیکھیے، جس سے معاشرہ مسموم تھا آج بھی جن کے ایٹی کیٹ (ETiQUETTE)

دنیاوی مشاغل ہیں جن سے انھیں دم بھر کو مہلت نہیں ملتی، ان کا ذکر کیا، ان کا تصوف اور ان کی شریعت
تو ان کی خواہشات ہیں۔

(۱۷) اے درویش سعادت کی نعمت جس کسی نے پائی ہے، خدمت ہی سے پائی ہے،
دین و دنیا کی فلاح و بہبود مشائخ کی خدمت میں ہے، (۲۸)
؏ ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد ــــ بلاشبہ مشائخ کی خدمت بہت بڑی سعادت ہے ؏ طریقت بجز خدمت
خلق نیست مگر اب مشائخ ہیں کہاں، جو ان کی خدمت سے دین و دنیا کی نعمتوں سے بہرہ مند ہو سکیں، علامہ
اقبال بتا گئے ہیں۔ ؎

میراث میں آئی ہے انھیں مسند ارشاد   زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

(۱۸) صوفی وہ ہے جو دنیاوی آلائشوں سے پاک و صاف ہے۔ جس کا آئینۂ دل مکدر یا
زنگ آلود ہے، وہ صوفی نہیں،
(۱۹) صوفی وہ ہے جس کا آئینۂ دل صاف و شفاف ہو، حتی کہ ہر شے اس میں منعکس ہو جائے
کچھ بھی پوشیدہ نہ رہے،
(۲۰) تصوف سے مراد خدا کی دوستی ہے، نور وحدت کے سوا دل میں اور کچھ بھی جا نہ ہو۔
یہی صفائے باطن ہے، گو لفظاً مختلف ہیں، مگر مفہوم واحد ہے، اللہ ہی کی دوستی و محبت سے قلب
آئینہ ہو جاتا ہے، حدیث مبارکہ ہے کہ اللہ کے ذکر سے قرآن پاک کی تلاوت سے اور موت کی یاد سے
آئینۂ دل کا زنگ چھوٹ جاتا ہے، اور دل آئینہ بن جاتا ہے،
(۲۱) حیات علم میں ہے، راحت معرفت میں ہے، شوق محبت میں ہے، اور ذوق یاد میں ہے (۵۵)
علم و معرفت اور محبت و یاد ــــ مراد علم الٰہی، معرفت الٰہی، محبت الٰہی اور یاد الٰہی ہے، اور
یہ کیفیات سے متعلق کلام ہے،

(۲۲) کوئی عبادت تلاوتِ قرآن سے بہتر نہیں، اس سے غفلت روا نہیں۔ (۳۱)
اولیاء اللہ تلاوت قرآن پاک میں اکثر محو رہتے تھے، اور رات دن میں کئی کئی قرآن پاک ختم
کر لیا کرتے تھے،

(۲۳) قرآن پاک کی تلاوت کے دوران حضوری اور مشاہدے کی نعمت نصیب
ہوتی ہے، اور عالم بالا کے راز بھی تلاوت کرنے والے پر منکشف ہوتے رہتے ہیں، (۴۱)
اللہ پاک قرآن پاک کی تلاوت کی سعادت نصیب فرمائیں، اور ایسی توفیق عنایت فرمائیں کہ
حقِ تلاوت ادا ہو جائے تو پھر سب ہی کچھ ہے،

(۲۴) بھوک کیا ہے، ابرِ رحمت ہے اس سے رحمت ہی کی بارش ہوتی ہے،
حضرت بابا صاحبؒ نے حضرت محبوب الٰہیؒ کو نصیحت فرمائی تھی، "روزہ داشتن نیمے راہ
است و اعمال دیگر چون نماز و حج (نفلی) نیمے راہ (اسرار الاولیاء ص ۱۲ اچ)

(۲۵) ضرورت مندوں کی خدمت میں مشغول رہنا۔ اوراد و وظائف سے افضل ہے، (۵۰)
یہی راہ سلوک ہے کہ ع طریقت بجز خدمتِ خلق نیست۔ یہی انسانیت کا اعلیٰ وصف
ہے، یہی حضرت بابا صاحبؒ کا عمل تھا، حضرت محبوب الٰہیؒ کا ارشاد ہے کہ حضرت بابا صاحبؒ کا
دستور یہ تھا کہ عصرؔ کی نماز کے بعد بھی اگر ضرورت مند ہوتے یا آجاتے تو وہ اوراد و وظائف میں مشغول
نہ ہوتے، بلکہ ضرورت مندوں کی سنتے اور ان کے دکھ درد کا درماں فرماتے، حالانکہ عصر و مغرب کا
درمیانی وقت صوفیۂ کرام کے لئے مشغولی خاص کا وقت ہے، اس وقت یادِ الٰہی کے سوا اور

لہ مولوی غلام احمد خان بریاں مرحوم نے ۱۳۰۳ھ میں اسرار الاولیاء کا اردو میں ترجمہ کر کے شائع کیا تھا اور
اردو سیر الاولیاء نام رکھا تھا جو اب کمیاب ہے، اس میں انھوں نے نماز دیگر کا ترجمہ ظہر کی نماز کیا ہے جو صحیح نہیں ہے
فارسی میں ظہر کی نماز کو نماز پیشین اور عصر کی نماز کو نماز دیگر کہتے ہیں، لاہور (پاکستان) میں آج تک یہ لفظ اسی
طرح مستعمل اور اہل پنجاب کی زبان پر ہیں۔

کسی طرف متوجہ نہیں ہوتے، مگر حضرت بابا صاحبؒ فرماتے تھے "کہ بر سر راہ محتاج بود و او مشغول
بورد ماند، در چنین حالتے اگر کسے بہ ورد مشغول باشد چہ ذوق یابد" (سیر الاولیاء ص ۲۲۴ چ)
ضرورت مند موجود ہوں اور اوراد و وظائف میں دل کیسے لگے گویا کہ ان کے دکھ درد کا احساس مشغولی
میں مانع رہتا ہے، اس ذکر کے بعد حضرت محبوب الٰہیؓ نے یہ شعر بھی پڑھا تھا۔ ؎

در کوے خرابات و سراے او باش
منعے نہ بود بیا و بنشین و بباش

(۲۶) سجادۂ طریقت اس کے لیے ہے، جو متوکلانہ بسر کرتا ہے، مخلوق میں سے کسی سے
توقع نہیں رکھتا، اگر ایسا نہیں تو وہ لائق سجادۂ طریقت نہیں ہے مدعی اور دروغ زن ہے (۶۲)
آج اس کے برعکس عمل ہے، جو جتنا فراہمی زر میں مشغول ہے اور امرا کی دریوزہ گری کرتا پھرتا
ہے، اتنا ہی وہ کامیاب سجادہ نشین ہے اور معزز و محترم ہے،

(۲۷) اے درویش بیماری اچھی چیز ہے، اس کی وجہ سے انسان گناہ سے پاک صاف ہو جاتا ہے (۶۲)
بیماری میں انسان اللہ کی طرف متوجہ ہوتا اور اسی کو فریاد رس سمجھتا ہے اس سے یقین کو
تقویت حاصل ہوتی ہے، اعتماد باللہ کو استحکام نصیب ہوتا ہے، جو بڑی اہم چیز ہے،

(۲۸) درویش کے روپ میں جو طلب دنیا میں مبتلا ہے، طلب جاہ و منزلت میں
کوشاں ہے وہ درویش نہیں وہ گمراہ ہے، اور گمراہی کے دشت و بیابان میں مارا مارا پھرتا ہے (۶۲)
درویش صورت رہزن بے غیرت ہر دو چور، سے دور ہی رہنا چاہیے، ان کے جال میں پھنسنا
خسر الدنیا والآخرۃ ہے مولانا روم نے فرمایا ہے، ؎

اے بسا ابلیس آدم روے است
پس بہر دستے نہ شاید داد دست

یہ ہیں معدودے چند جواہر پارے جو اسرار الاولیاء کے اوراق کی زینت ہیں، پوری کتاب
ایسے ہی جواہر پاروں سے مالا مال ہے، پوری کتاب میں کوئی ایسی روایت یا کوئی مقولہ ایسا نہیں

جو آئینِ شریعت و اصولِ تصوف یا عقائدِ اہلسنت کے خلاف ہو، اس سے یہ بھی واضح ہے کہ حوادث روزگار سے دوچار رہنے کے باوجود اور عقیدت مندوں کی سخت بے اعتنائی کے باوجود اسرار الاولیاء بے پناہ قدر و منزلت کی مستحق ہے، اور اس سے کیا کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے، اخلاق و معاشرہ کی اصلاح کے لیے اس میں وہ کچھ ہے، جو ہمیں درکار ہے، اللہ پاک اکتسابِ سعادت کی توفیق عنایت فرمائیں، آمین ثم آمین۔

بعض اہم ترین روایتیں کتب ملفوظات کا مطالعہ شاہد ہے کہ بظاہر کتبِ ملفوظات کی روش مین نمایاں فرق نہیں ہے، نقطۂ نظر ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے، کہ انسان قرآنی تعلیمات کی راہ نمائی کے سہارے خدا رسیدہ ہو جائے، جو واحد ذریعہ ہے خدا وسی کا، اصلاحِ اخلاق معاشرے کا سدھار، انسانی ہمدردی غرض جو بھی کچھ ہے، اسی کے فروعات ہیں، اسلام کا بنیادی نقطۂ نظر یہی ہے، جو کلمۂ لا الٰہ الا اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے، اور جو کچھ ہے وہ اسی کی فروعات و ثمرات ہیں صوفیائے کرام اسی روش پر کاربند رہے، جس کی بدولت معاشرہ مین سدھار آیا اور انسانیت نے فروغ پایا،

بہرحال جب کتب ملفوظات کو نظرِ تعمق سے مطالعہ کیا جاتا ہے، تو ہلکا سا امتیاز ملتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ جن ملفوظات کے سامعین میں کوئی ایسی شخصیت بھی ہے، جسے مخلوق کی خدمت و رہنمائی اور شیخ کی جانشینی کی ذمہ داری سونپنی ہے، تو ان مین کچھ ایسی روایتین بھی ہیں کہ سطحی نگاہ ان کی کُنہ کو نہیں پہنچتی، اور ان کی تفہیم سے وہ قاصر رہتے ہیں، جو ذوقِ تصوف سے لذت آشنا نہیں ہوتے، اور وہ تردد بے جا مین مبتلا ہو کر راہِ حق سے دور جا پڑتے ہیں، وَاللّٰہُ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَاءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ○

اسرار الاولیاء مین بھی ایسی روایتین ہیں جن کی تفہیم سے خصوصاً مادہ پرست اذہان

قاصر رہتے ہیں ان ہی مین سے بعض کو پیش کیا جاتا ہے، اور مناسب محل طریقِ تفہیم کی یا اس کے پس منظر کی وضاحت اور ان نکات کی موشگافی کی کوشش کی جائے گی جو تفہیم میں قدرے حائل ہو سکتی ہیں جو در اصل تل اوجھل پہاڑ کی مصداق ہیں،

روایت نمبر۱ مولانا بدر الدین اسحاقؒ لکھتے ہیں:۔

"غلبات شوق میں حضرت بابا صاحبؒ نے یہ حکایت بیان فرمائی کہ جب حضرت یوسفؑ نے حضرت زلیخا کو چاہا او بلایا تو وہ آئیں اور انھوں نے دین یعقوب علیہ السلام کو قبول کیا اور اللہ پاک کی عبادت میں مشغول رہنے لگیں، کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت یوسفؑ نے ان سے خلوت چاہی تو وہ بھاگیں حضرت یوسفؑ نے ان کا پیچھا کیا اور پکڑ لیا، اور ان سے کہا کہ یہ کیا بات ہے کہ پہلے تو تم میرا پیچھا کرتی اور مجھے پکڑتی تھیں، اب میں چاہتا ہوں تو تم مجھ سے بھاگتی ہو، حضرت زلیخا نے کہا کہ اے یوسفؑ جب تو میں خدا سے ناواقف تھی، اور تمھارے سوا مجھے کسی سے محبت و انسیت نہ تھی لیکن اب مین نے رب کو پالیا ہے، اب مین اسی کی عبادت در عشق میں لگی رہتی ہوں، مجاہدے سے مجھے مشاہدے کی نعمت نصیب ہو گئی ہے، اسکی محبت نے میرے دل میں گھر کر لیا ہے، اے یوسفؑ اب تم اور تم سے لاکھوں درجے افضل بھی کوئی ہو تو ڈبھی میری نظر میں سما نہیں سکتا، پھر جب مجھے اللہ سے محبت ہو گئی اور میں اس کی ہو گئی ہوں تو اگر میں کسی اور سے محبت کرنے لگوں تو میں دروغ گو اور جھوٹی ہوں، اور محبت میں یہ بات زیبا نہیں۔"

مقصد واضح ہے کہ اللہ کا ہونے کے بعد کسی اور کی چاہت یا طلب ہرگز مناسب نہیں یہی تو توحید خالص ہے اور، نہ سچی محبت اس کی اجازت دیتی ہے، بیان واقعہ سے واقعہ ہی مراد نہیں ہوتا بلکہ اس کا اثر و نتیجہ بھی مراد ہوتا ہے، اس واقعہ سے مقصود استحکام محبتِ الٰہی کا اظہار ہے، اور بس،

یہ حکایت قبل از تاریخ واقعات سے متعلق ہے، اس پر تاریخی واقعہ کا اطلاق نہیں ہوتا، فن تاریخ کا آغاز مسلمانوں کا مرہون منت ہے، دانشوران یورپ کو بھی اسکا اعتراف ہے، اس روایت کو تاریخی واقعہ سے تعبیر کرنا عجز و اتفیت کی علامت ہے، البتہ اسکا تعلق اسرائیلیات سے ہے، قرون اولیٰ میں علمائے یہود جو مسلمان ہو گئے تھے وہ قصص القرآن سے متعلق اسرائیلی روایات کو بھی بیان کیا کرتے تھے لہذا اگر وہ روایات کفر و شرک کی آمیزش سے پاک ہیں تو انھیں اپنا لینے میں کچھ مضائقہ نہیں، ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

حَدِّثُوْا عَنْ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ وَلَا   بنی اسرائیل کی روایات نقل کرو اس میں

حَرَجَ،   کوئی حرج نہیں ہے،

اس ارشاد کی تعمیل میں ہمارے علماء و مفسرین نے متعدد روایتیں بنی اسرائیل سے نقل کی ہیں، یہ بھی ان ہی میں سے ہے، سورۂ یوسف کی تفسیر پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں اس روایت کو اپنایا ہے، ہمارے مشائخِ کرام نے بھی اعتنا فرمایا ہے، برصغیر ہند و پاک کے سب سے پہلے مشہور و مقبول اسلامی مبلغ عالم درویش کامل حضرت داتا گنج بخش لاہوری رحمۃ اللہ علیہ (سید علی ہجویری) نے لکھا ہے،

"چوں یوسف با یعقوب رسید خداوند دیرا وصال یوسف کرامت کرد، زلیخا را جوان کرد با سلام راہ نمود، و بزنی یوسف داد، یوسف قصد وے کرد، زلیخا از وے گریخت" کشف المحجوب ص ۲۶۲

حضرت بابا صاحبؒ نے ذکر فرمایا ہے جو عارف کامل اور بے مثل عالم شریعت و طریقت تھے، مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ نے مثنوی یوسف زلیخا میں کمال شستگی سے اس واقعہ کو بیان فرمایا ہے، یہ مثنوی مدارس اسلامیہ میں مدتوں سے داخل درس ہے، مولانا جامیؒ وہ جلیل القدر عالم بلکہ عالم گر ہیں جن کی شرح جامی اسلامی درس گاہوں کے نصاب میں مدت مدید سے شامل اور آج تک داخلِ نصاب ہے، جسے پڑھ کر طالب علم عالم بنتے ہیں،

ہمارے لیے اتنا ہی بہت ہے کہ ہمیں یہ روایت ثقہ بزرگوں سے پہنچی ہے، ہمیں اس سے بحث نہیں کہ یہ روایت آج یہودیوں کے علمی ذخیرے میں ہے، یا نہیں ہے، کیونکہ رد و بدل ان کی دیرینہ عادت ہے،

اسی کی بدولت وہ کتاب مقدس توریت کو بھی محفوظ نہیں رکھ سکے ہیں، رب العٰلمین کا یہ ارشاد ان ہی کے لیے یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِہٖ اور قدیم علمائے یہود میں سے کسی نے انکار بھی نہیں کیا ہے، پھر ثقہ بزرگوں کی روایت کو ہر اعتبار سے ترجیح ہے، اس روایت کے متعلق اتنی ہی معلومات مناسب ہے، جس سے اس کی نوعیت و اہمیت واضح ہے۔

اس روایت میں کئی جملے ایسے ہیں جو روایت کی جان اور روح رواں ہیں اور ایسے ہی بزرگ کے فرمودہ ہو سکتے ہیں جو توحید و حق شناسی کی نعمت سے مالا مال ہو گا، ان جملوں کو دہرائیے اور ان کی نورانیت اور کیف سے لطف حاصل کیجئے، عجب پُرکیف جملے ہیں۔

این زمان کہ حق تعالیٰ را بشناختم ــ در پرستش او مشغول شدم از مجاہدہ بمشاہدہ او نافتم ــ چون مرا حق تعالیٰ الفت شد ــ اگر بعد ازیں با غیرے او الفت گیرم ــ مدعی دروغ زن بودم ــ

یہی شواہد برابر مونھ سے پڑے بول رہے ہیں کہ اسرار الاولیار کا انتساب حضرت بابا صاحبؒ سے بلاشبہ صحیح اور درست ہے،

روایت ۲ | حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا کہ ایک دفعہ یہ دعاگو حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشیؒ اور قاضی حمید الدین ناگوریؒ کے ساتھ محفل سماع میں تھا، سماع ہو رہا تھا، دونوں بزرگ سماع میں محو تھے، یک شبانہ روز رقص فرماتے رہے، البتہ نماز کے وقت نماز پڑھ لیتے تھے، کیف کے دوران میرا ہاتھ پکڑا اور محو کیف ہو گئے اور رقص فرمانے لگے، گانے والے جو قصیدہ گا رہے تھے، وہ یہ تھا، ؎

من آں نیم کہ زعشق تو پائے پس آرم   اگر بہ تیغ کشندم در تو نہ گزارم
مپرس از شبِ ہجراں چگونہ می گزرد   مہا د ہیچ کسے را قولیست و شوارم

من از جمالِ تو اے سرو باغ تا دیدم — ہوس نہ شد کہ گہے دل رود بہ گلزارم
اگر دہند بفردا بہشت با ہمہ چیز — بجبہ نہ خرم من کہ مست دیدارم[1]

اس روایت سے یہ واضح ہے کہ اتباعِ شریعت ان حضرات کی طبیعت ثانیہ تھی، اور اتباع کا ملکہ ایسا راسخ اور پختہ تھا کہ کیسی ہی کیفیت ہو نماز بروقت ادا فرماتے تھے، جو عجوبۂ روزگار ہی، نماز دین کا ستون ہے، اگر ستون برقرار نہ رہے تو دین و ایمان کہاں، تصوف کی معراج یہی ہے کہ صوفی عاملِ شریعت ہو، اگر یہ نہیں تو خاک بھی نہیں، اس روایت میں بروقت نماز پڑھنے کی عملی ترغیب و تحریض ہے، ممکن ہے کہ بے نمازیوں کو اس سے وحشت ہوتی ہو، اور وہ اسے اقوال نامناسب میں شمار کرتے ہوں یا در ہوا شد[2] کے غلط معنیٰ سے کوئی متاثر ہو جس کی وضاحت حاشیہ میں آچکی ہے، ورنہ اس میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے سادہ وصاف ہے اعمال صوفیہ کے مطابق ہے،

روایت ۳ — حضرت باباصاحبؒ نے فرمایا کہ یہ دعاگو اور برادرم مولانا بہاء الدین (زکریا ملتانی)ؒ ایک جگہ بیٹھے ہوئے سلوک کی باتیں کر رہے تھے، ذرا دیر بعد برادرم مولانا بہاء الدینؒ اٹھ کھڑے ہوئے، زار و قطار رونے لگے اور کہا، اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ، میں نے کہا کیا بات ہے، انھوں نے کہا اٹھو اور دیکھو، میں اٹھ کھڑا ہوا، دیکھتا کیا ہوں کہ دروازۂ بغداد سے شیخ سعد الدین حمویہؒ کا جنازہ لائے ہیں، اور بغداد کی جامع مسجد کے سامنے نماز جنازہ پڑھ رہے ہیں (اسرار الاولیاء ص ۱۱)

یہ روایت سادہ وصاف ہے، اس میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے، البتہ سطحی علم رکھنے والوں کو دو اشکال لاحق ہو سکتے ہیں، ایک تاریخی اندراج سے متعلق اور دوسرا بصیرت باطنی سے متعلق، تاریخی خلفشار و اندراج کے متعلق یہ دو نکات ذہن نشین رکھنے چاہئیں، (۱) اسرار الاولیاء کا عہد تدوین ۶۵۵ھ تا ۶۶۹ھ ہے البتہ اس کتاب کے آغاز میں جو ۶۳۱ھ لکھا ہے وہ غلط اور تحریف شدہ ہے، (۲) شیخ سعد الدین حمویہؒ کے سال وفات کے متعلق حضرت محبوب الٰہیؒ کے ارشاد سے رہنمائی حاصل

[1] اسرار الاولیاء ص ۵۰، [2] در ہوا شد کے معنی ہیں کہ ذوق و شوق میں محو و مستغرق ہو گئے، یہ ترجمہ غلط ہے کہ اڑنا شروع کیا یا ہوا میں معلق ہو گئے،

حاصل کرنی چاہئے، حضرت والا کا ارشاد ہے:

اول شیخ سعد الدین حمویہؒ نقل کرد، بعد از دو سہ سال شیخ سیف الدین باخرزیؒ — بعد از دو سہ سال شیخ بہاء الدین زکریا — بعد از دو سہ سال شیخ فرید الدین رحمۃ اللہ علیہم (سیر الاولیاء، ص ۹۱ و ج فوائد الفواد ص ۱۳۰)

پہلے شیخ سعد الدین حمویہؒ نے انتقال فرمایا، ان سے تین سال بعد شیخ سیف الدین باخرزیؒ نے انتقال فرمایا، ان سے تین سال بعد شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے انتقال فرمایا، ان سے تین سال بعد حضرت باباصاحبؒ نے انتقال فرمایا، رحمۃ اللہ علیہم۔

تذکروں میں جو سنین مرقوم ملتے ہیں، وہ عموماً سماعی اور خلاف تحقیق ہوتے ہیں، اسی لیے وہ مختلف بھی ہیں لہٰذا ان پر بلا تحقیق اعتماد نہیں کیا جا سکتا حضرت محبوب الٰہی کے ارشادات کے مطابق اور بروے تحقیق حضرت باباصاحبؒ کا سنہ وفات ۶۷۰ھ ہے[1]، ۶۶۴ھ وغیرہ سنین غلط اور بالکل غلط ہیں،

شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کا سنہ وفات بروے تحقیق ۶۶۷ ہجری ہے، جو حضرت محبوب الٰہیؒ کے مذکورہ بیان کے مطابق بھی ہے، ۶۶۱ھ غلط اور نہایت غلط ہے،

شیخ سیف الدین باخرزیؒ کا سنہ وفات حضرت محبوب الٰہیؒ کے ارشاد کے مطابق اور حضرت باباصاحبؒ کے سنہ وفات کی مطابقت میں ۶۶۴ - ۶۶۳ھ ہے،

شیخ سعد الدین حمویہؒ کا سنہ وفات بھی حضرت محبوب الٰہیؒ کے ارشاد کے مطابق اور حضرت باباصاحبؒ کے سنہ وفات کی مطابقت میں ۶۶۱ - ۶۶۰ ہجری ہے، سنہ ۶۵۰ھ یا ۶۵۵ھ یا ۶۵۰ھ غلط اور بالکل غلط ہے،

[1] جرنل آف سکھ اسٹڈیز امرتسر اگست ۱۹۷۶ء ص ۳ تا ۹، ۳۰ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ مارچ ۱۹۸۰ء ص ۱۹۳ تا ۱۹۶

حضرت محبوب الٰہی بصیرت باطنی سے مالامال اور کثیر المطالعہ بزرگ تھے، تذکروں میں نوشتہ سنین کے غیر مستند ہونے کا یقیناً انھیں احساس تھا، تعجب نہیں کہ اسی احساس کی بنا پر ان بزرگوں کے انتقال کے باہمی فصل کا ذکر فرما دینا آپ نے مناسب سمجھا ہو اور جو کچھ آپکے ارشاد کے مطابق ہے وہ حرف حرف صحیح ہے، تذکروں میں جو سنین لکھے ہیں، ان پر بلا تحقیق اعتماد نہیں کیا جا سکتا،

اسرار الاولیاء کے عہد تدوین سے متعلق تحقیق سے بتایا جا چکا ہے کہ اس کا عہد تدوین ۶۵۱ھ تا ۶۶۹ھ ہے، لہٰذا جن بزرگ کا انتقال ۶۶۰-۶۶۱ھ میں ہوتا ہے، تو ان کا ذکر ۶۵۱ھ تا ۶۶۹ھ کی نوشتہ کتاب میں ہونا صحیح اور بالکل صحیح ہے، اور اسرار الاولیاء میں شیخ سعد الدین حمویہؒ کی وفات کا ذکر صحیح اور برمحل ہے، اس میں اختلاف و تردد کی گنجائش نہیں ہے،

دوسری مشکل جو سطحی علم رکھنے والوں کو لاحق ہو سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے اور حضرت بابا صاحبؒ نے شیخ سعد الدین حمویہؒ کے نماز جنازہ کے منظر کو کیسے دیکھ لیا تھا، اس کا تعلق بصیرت باطنی سے ہے، مختصراً اتنا ہی عرض کر دینا کافی ہے کہ یہ مشہور و معتبر روایت ہے کہ حضرت ساریہؓ مصر میں قبطیوں سے جنگ فرما رہے تھے، امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ میں جمعہ کی نماز کا خطبہ دیتے ہوئے فرمایا یا ساریۃ الجبل حضرت ساریہؓ حضرت عمرؓ کی آواز سے متنبہ ہوئے، پہاڑ کی طرف رخ کیا، جہاں قبطی چھپے ہوئے تھے، اور اس انتظار میں تھے کہ حضرت ساریہؓ اور ان کا لشکر آگے نکل جائے تو پیچھے سے یہ حملہ کر دیں، اور شکست خوردہ مصری فوج پلٹ کر مقابلہ کرنے لگے، اس طرح گھیر کر اسلامی لشکر کو شکست دیدیں، واقعہ سے آگاہی اور حضرت ساریہؓ کو متنبہ فرمانا اور حضرت ساریہؓ کا یقین و اعتماد اور تعمیل ارشاد اسی پر شیخ الاسلام بہاء الدین زکریاؒ کی اور حضرت بابا صاحبؒ کی شیخ سعد الدین حمویہ کے واقعہ وفات سے آگاہی کو قیاس کر لینا چاہیئے، ورنہ یہ تصوف کا اہم مسئلہ ہے تا وقتیکہ مادیت کے پردے مرتفع نہ ہوں، اس کی حقیقت تک رسائی نہیں ہو سکتی، اس اشکال کے رفع ہونے کے بعد اس روایت کو درست مان لینے میں کوئی شے مانع نہیں رہتی،

(باقی آئندہ)

امام الحرمین عبدالملک جوینی

از جناب مولوی نصر احمد صاحب پھلواروی

(سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو معارف ستمبر ۱۹۷۰ء)

نظامیہ نیشاپور اور امام الحرمین کا درس

نظام الملک نے ہر شہر میں اہل علم کے لیے مدرسے اور کتبخانے تعمیر کئے، اور ان کے مصارف کے لیے ان پر جاگیریں وقف کیں[1]، پایہ تخت میں اس کی نگاہ انتخاب امام الحرمین پر پڑی، اس لئے ان کے فیض درس کو عام کرنے کے لیے ایک بہت بڑا مدرسہ نیشاپور میں قائم کیا، اور اس کا نام نظامیہ رکھا، سلجوقی ذوق تعمیر میں بہت ممتاز سمجھے جاتے تھے، اس لئے نظام الملک کی تعمیرات بھی عجائبات میں شمار کی جاتی ہیں، اس کی مثال نظامیہ اصفہان میں ایک مینارہ کا زینہ تھا، چنانچہ مینارہ پر جانے کے لیے اگر بیک وقت تین آدمی اس کی تین سیڑھیوں پر چڑھیں تو مینارہ کے اوپر پہونچنے تک ان میں سے کوئی دوسرے کو نظر نہیں آتا تھا[2]،

اب نیشاپور کے نظامیہ کا اسی سے اندازہ کیا جائے کہ اس میں فن تعمیر کے کیسے کیسے کمالات دکھائے گئے ہونگے، لیکن افسوس کہ امتداد زمانہ سے اس کا نام و نشان مٹ گیا ہے، صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ ایک پر شکوہ عمارت تھی، اس کے ساتھ چمن، پارک اور تالاب و نہریں جاری تھیں، طلبہ یہاں مطالعہ اور مذاکرہ کرتے تھے، تالاب کی سیڑھیاں نشتر تھیں، ابو الحسن علی الکیا ہراسی درس کے بعد تالاب کے کنارے استاذ کی تقریر زبانی یاد کرتے تھے، اور ہر سیڑھی پر اسے سات بار دہراتے تھے[3]،

---

[1] تاریخ دولۃ آل سلجوق ص ۵۴ [2] محاسن اصفہان ۱۰۲ [3] المنتظم ۹/ ۱۲۰ طبقات ۴/ ۲۸۲

جس سرزمین پر امام الحرمین کبھی ایک گوشے میں مسند درس بچھاتے تھے، وہاں اکناف عالم سے کشاں کشاں لوگ چلے آتے تھے، طوس سے امام غزالی کے ساتھ ایک جماعت آئی[1] نیشاپور کی تمام درسگاہیں ٹوٹ ٹوٹ کر اس سے مل گئیں، اور یہ عروس العمارات مدرسہ کعبۂ علم وفن بنگیا، امام کے درس میں منتخب اور مستعد طلبہ کبھی تین چار سو سے کم نہیں ہوتے تھے، ان ہی میں نظام الملک کا برادر زادہ عبدالرزاق طوسی اور وزارت اور شاہی خاندان کے دوسرے افراد بھی نظر آتے تھے، امام غزالی، ابوالمظفر خوافی، ابوالحسن علی کیا ہراسی معید درس ہوتے تھے،[2]

امام نہایت خوش بیان تھے، ان کی درسی تقریر کافی طویل اور مبسوط ہونے کے ساتھ نہایت مرتب ومربوط ہوتی تھی، اپنے دلنشیں انداز بیان اور افہام وتفہیم کے خاص ملکہ کی وجہ سے مشکل اور دادق مباحث کو سادہ اور عام فہم کر دیتے تھے،[3] درسی تقریر کا یہ انداز امام کے کمالات میں سے ہے، ان کے والد کے ذکر میں بیان کیا گیا ہے کہ ان کو تدریس میں مہارت تام حاصل تھی، ابو محمد جرجانی کا بیان ہے کہ امام کے درس میں حاضر ہونے کے لیے خراسان، حجاز اور عراق کے لوگ شد رحال کر کے آتے تھے[4] ان کی وفات کے بعد بھی ان کے مسند درس کو اسی عظمت وشان سے باقی رکھنے کے لیے، اصحاب کمال کا انتخاب ہوتا تھا، ملک شاہ کے لڑکے سلطان سنجر کے عہد میں اس کے وزیر فخر الملک بن نظام الملک نے اس منصب کو قبول کرنے کے لیے امام غزالی کو دمشق خط لکھا، چنانچہ ذیقعدہ ۴۹۹ھ میں امام غزالی نے استاد کی جگہ نیشاپور کے مدرسۂ نظامیہ میں درس دینا شروع کیا اور ایک سال تک درس دیا،[5] ان سے قبل ابوسعید عبدالواحد قشیری پانچ سال تک یہاں درس دے چکے تھے، اور امام کے شاگرد

---

[1] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۴ ص ۱۰۶ [2] یہ جس زمانہ کا ذکر ہے اُس زمانہ میں نامور علما کے ہاں معمول تھا کہ جب وہ درس دے چکتے تو شاگردوں میں جو سب سے زیادہ لائق ہوتا تھا وہ باقی طالب علموں کو دوبارہ درس دیتا تھا اور استاد کے بتائے ہوئے مضامین کو اچھی طرح ذہن نشین کراتا تھا، یہ منصب جس کو حاصل ہوتا تھا اسکو معید کہتے تھے [3] ابن خلکان ۱/۵۱۵ [4] المنقذ من الضلال ۳۰-۲۵،

شیخ ابوالقاسم انصاری مدرسہ کی لائبریری کے نگران تھے[1]، اور چھٹی صدی میں ابوالمعالی مسعود بن احمد خوافی (م ۵۵۶ھ) اور ابوالمعالی قطب الدین مسعود (م ۵۰۸ھ) اور امام کے دلبستگان میں سلطان سنجر کا وزیر عبدالرزاق طوسی (م ۵۱۵ھ) کے اسمار بھی شیوخ نظامیۂ نیشاپور کی فہرست میں آتے ہیں،[2]

یہاں ان کی روشنی ایسی پھیلی کہ دوسرے چراغ ماند پڑ گئے، ابن عساکر کا بیان ہے،

"دیگر حلقہائے درس خموش ہوگئے، کشور علم میں ان کی حکمرانی اور ان کے بے پایاں علم کے اثر سے فقہاء اور علماء گوشہ خمول میں جا چھپے اور اطراف وجوار علمی کساد بازاری کا شکار ہوگئے، اور امام کے مخصوص تربیت یافتہ محققین اور تلامذہ سے بازار علم آباد دوبارہ نو ہوا،[3]

ع گئے سٹراپا چراغ ایسے کہ گل بندہ بند ہ گئے ان میں

امام الحرمین کے مناظرے مشاہیر اور چوٹی کے علماء ان سے مناظرے میں بند ہو جاتے تھے، مسئلہ خلق قرآن پر ایک فلسفی سے مناظرہ ہوا، اس نے اپنے دعوی کو اس طرح مدلل کیا کہ علماء اس کی تردید نہ کر سکے، لیکن امام نے ایک ایک کر کے اس کے تمام دلائل رد کر دیئے، اور مسلک حق کو اس طرح واضح کیا کہ حضرت شیخ ابوالقاسم قشیریؒ نے امام کی قدرت کلامی کی داد دی اور مسرت کا اظہار فرمایا،[4] علامہ تاج الدین السبکی نے مناظرہ کے وقت امام کے استحضار کو اس شعر میں بیان کیا ہے،

ابداً علی طرف اللسان جوابہ فکانما ھی دفعۃ من صیب

یکبارگی برس پڑنے والی بارش کی طرح ہمیشہ ان کی نوک زبان پر جواب موجود ہوتا تھا،

۴۷۵ھ میں شیخ ابواسحٰق شیرازی نیشاپور آئے، وہ نظامیۂ بغداد کے مدرس اعظم تھے، اور نیشاپور میں امام بھی موجود تھے، اسی تقریب سے نظام الملک نے مجلس مناظرہ آراستہ کی اور قصر وزارت میں

---

[1] طبقات ۴/۲۲۳ [2] ایضاً ۴/۲۵۴-۲۰۹-۲۰۸ [3] تبیین کذب المفتری [4] طبقات ۳/۲۵۳

سمائے علم کے ماہ و خورشید کا قران السعدین ہوا۔[1]

فقہ کا مسئلہ ہے کہ اگر کوئی شخص ایسی جگہ پہونچ جائے جہاں اسکو سمت قبلہ کا پتہ نہ چل سکے اور نماز کا وقت ہوجائے تو وہ تحری کرے یعنی غور و فکر کرکے خود فیصلہ کرے جس سمت اس کا قلب مطمئن ہو اسی طرف رخ کرکے نماز ادا کرلے، نماز ادا کرنے کے بعد اگر اس کی تحقیق ہوجائے کہ اس نے قبلہ رُخ نماز نہیں پڑھی تھی جب بھی نماز دہرانے کی ضرورت نہیں ہے، اگر نماز کی حالت میں معلوم ہوجائے یا خود اس کا ظن غالب دوسرے رخ کی طرف ہوجائے تو نماز ہی میں اُس رخ کو مڑ جائے، اس مجلس میں امام اور شیخ کے درمیان یہی مسئلہ موضوع بحث ٹھرا، امام کا خیال یہ ہے کہ تحری میں خطا کے یقین ہوجانے کے بعد اعادۂ صلوٰۃ واجب ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ استقبال قبلہ کے از شرائط صلوٰۃ ہے، جب شرط نہیں تو مشروط کا وجود بھی نہیں، جس طرح وقت نماز کے شرائط میں سے ہے، اور وقت شروع ہونے سے قبل یا ختم ہونے کے بعد نماز پڑھنے کی صورت مین اعادہ واجب ہے،

اس کے بعد دوسرا مسئلہ زیر بحث آیا کہ ولی کے لیے باکرہ بالغہ کا نکاح کرنا اس کے بغیر اذن جائز ہے یا نہیں، اس مسئلہ میں شیخ ابو اسحاق کے نزدیک ولی بغیر اذن کے اس کا نکاح کرسکتا ہے، مگر امام الحرمین اذن کو ضروری قرار دیتے ہیں، ان دونوں بزرگوں میں دونوں مسئلوں پر خالص اصولی انداز سے طویل گفتگو ہوئی، ان دونوں مسئلوں پر امام کے مستقل رسالے بھی ہیں، یافعی نے لکھا ہے کہ، اس مناظرہ میں امام کے تفقہ اجتہاد کا رنگ نمایاں رہا، یہ مناظرہ علمار کے بڑے اجتماع مین ہوا تھا بغداد سے شیخ کے ساتھ آنے والے یہ علمار تھے، فخر الاسلام ابوبکر شاشی، حسین بن علی طبری مصنف عمدہ، ابن بیان مدرس بصرہ، ابو معاذ، ابو ثعلب الواسطی، عبدالملک شابر خواشتی، ابوالحسن الآمدی، ابوالقاسم الزنجانی، ابوبکر محمد بن علی المیانجی، ابو علی الفارقی، ابوالعباس ابن الرطبی،[2]

[1] ابن خلدون ۳/ ۴۶۳، ابن اثیر ۱۰/ ۲۲، تاریخ دولۃ آل سلجوق ۶۹ [2] مرآۃ الجنان ۳/ ۱۱۲ و طبقات ۳/ ۹۱

علمی مناظروں میں فتح کا عَلَم ہمیشہ امام کے ہاتھ رہتا تھا، لیکن یہ بات ان کی طلاقت لسانی یا مناظرانہ داؤ پیچ کی وجہ سے نہیں ہوتی تھی، بلکہ اس میں ان کے علمی تبحر اور زور استدلال کو دخل ہوتا تھا، اس لئے کہ جہاں تک طلاقتِ لسانی کا تعلق ہے اُن میں ایک خلقی نقص موجود تھا، جس کا اعتراف خود انھوں نے ذیل کے واقعہ میں کیا ہے، ایکبار کسی مناظرہ میں ان کی زبان لکنت زدہ ہوگئی اور رکنے لگی اسوقت انھوں نے اپنے ایام رضاعت کا واقعہ بیان کیا کہ ان کے محلہ میں ایک کنیز تھی وہ ان کے ہاں پہونچی، ان کی والدہ کسی کام میں مصروف تھیں، وہ بھوک سے رو رہے تھے، اس کنیز نے اپنی گود میں لے لیا، اسی وقت ان کے والد شیخ جوینی آگئے، یہ دیکھ کر وہ سخت ناراض ہوئے، جسقدر دودھ پیا تھا قے کرا دیا، انکی زبان مین یہ خلقی نقص اسی شیر کنیز کا اثر ہے، ابن خلکان نے لکھا ہے کہ یہ کیفیت مناظرہ کی کسی مجلسوں میں دیکھی گئی،[1]

جامع منیعی میں امام الحرمین کا وعظ

محی السنۃ امام بغوی کے استاذ حسان بن سعید المخزومی منیعی (م ۴۶۳ھ) نے نیشاپور میں عالیشان مسجد تعمیر کی، حسان تجارت کرتے تھے، اور ان کے تقوی و طہارت کی بنا پر سلطان الپ ارسلان ان کا ثنا خواں ہوکر کہتا، "میرے حدود سلطنت میں ایک بندہ خدا ہے جو مجھ سے نہیں اللہ سے ڈرتا ہے"[2] اس درویش صفت مرد کے اخلاص کی برکت سے نیشاپور کی اس جامع منیعی کو بڑی شہرت و عظمت حاصل ہوئی بیس سال تک شیخ الاسلام ابو عثمان الصابونی اس کے خطیب رہے،[3] ان کے بعد امام ہر جمعہ کو یہاں وعظ کہنے لگے ان کے وعظ میں علم و حکمت کے درس اور بیش بہا معلومات کی فراوانی ہوتی تھی، اور طویل ترین مضامین کو اختصار و ایجاز کے ساتھ بیان کرنا انکا امتیاز تھا، بیش پا افتادہ مضامین کو اس خوش اسلوبی سے بیان کرتے تھے کہ اس میں تاثیر اور دلکشی پیدا ہوجاتی تھی، امام نے سلطان ابو سعید ابو الخیر

[1] ابن خلکان ۱/ ۵۱۶ [2] المنتظم ۸/ ۲۶۰، العبر ۳/ ۲۵۳ [3] طبقات ۳/ ۱۱۸

جیسے صوفی اور صاحبِ حال بزرگ کی صحبت صغر سنی میں پائی تھی،[۱] اس لئے امام کو تصوف سے قلبی مناسبت تھی اور صوفیہ کے حالات سے انکو شغف تھا، انکا وعظ اگر کسی وقت خالص علمی ہوتا تھا، تو بعض وقت احسان و عرفان کی باتوں اور صالحین امت کے تذکروں پر بھی مشتمل ہوتا تھا، اس لئے وعظ میں مجمع پر بے خودی و وارفتگی طاری ہوجاتی تھی، وہ خود بھی روتے اور سب کو رلاتے،

ابن خلکان کا بیان ہے،

کان اذا شرع فی علوم الصوفیۃ	صوفیہ کے علوم اور اقوال کی تشریح
وشرح الاقوال ابکی الحاضرین[۲]	کرتے تو حاضرین کو رُلا دیتے،

تبیین میں ہے،

اذا شرع فی حکایۃ الاحوال	اپنی مجالس وعظ میں صوفیہ کے علوم اور
وخاض فی علوم الصوفیۃ	ان کے حالات و مقامات کے بیان پر
فی فصول مجالسہ بالغدوات	آتے تو خود بھی روتے اور سبھوں کو رلاتے،
ابکی الحاضرین ببکائہ[۳]	

شافعی مذہب میں امام الحرمین کا مرتبہ

شاطبی، محدث ابن الصلاح اور امام نووی نے کہا کہ جب تک کرۂ ارض اسلام اور مسلمانوں کے وجود سے روشن ہے، اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے، اور کوئی زمانہ مجتہدین سے خالی نہیں، چنانچہ صدر اسلام سے پانچویں صدی تک اصحابِ اجتہاد کی طویل فہرست ملتی ہے، اور بقول حضرت شاہ ولی اللہؒ شافعی مذہب میں ایسے فقہاء ہر عہد میں موجود رہے ہیں جو اجتہاد کے اعلیٰ مراتب پر فائز تھے، پانچویں صدی میں امام الحرمین اسی طائفہ میں تھے، امام الحرمین کے مرتبہ کی تعیین کرتے ہوئے مورخین فقہ اسلامی نے ان کو مجتہدین منتسبین کی صف میں رکھا ہے،[۴]

[۱] اسرار التوحید فی مقامات الشیخ ابی سعید ۱۰۸، [۲] ابن خلکان ۱/ ۲۵۱ [۳] تبیین ۲۷۸ [۴] الانصاف فی بیان سبب الاختلاف ص ۳۰،

مجتہد کی تین قسمیں بیان کی جاتی ہیں، مستقل منتسب اور مجتہد فی المذہب، اجتہاد بالاستقلال اور بالانتساب کے لیے پانچ علوم میں کامل دسترس ہونی شرط ہے، کتاب اللہ، حدیث نبویؐ، مذاہبِ سلف، قیاس اور لغت، ان میں سے کسی ایک میں کمی کی بنا پر تقلید لازم ہوگی، ائمہ اربعہؒ چونکہ ان شرائط کے ساتھ اپنے اصول اجتہاد کی تدوین کی اور کسی دوسرے اصول کو قبول نہیں کیا، ان کو مجتہد مستقل کہتے ہیں اور یہ اعلیٰ مرتبۂ اجتہاد ہے، مجتہد منتسب، امام منسوب الیہ کے بعض اصول کی مخالفت بھی کرتا ہے لیکن اقوال و مسائل میں بیشتر کو قبول کرتا ہے، اور وہ اپنے اجتہادات کے دلائل کی تلاش اور مآخذ تک رسائی میں امام منسوب الیہ کے طریقہ سے روشنی حاصل کرتا ہے، اس کے مجتہدات و استنباطات اس امام کے نصوص سے مستفاد ہوتے ہیں،[۱]

فقہ اسلامی کا وسیع سرمایہ امام الحرمین کے احاطۂ علم میں تھا، ان کے فتاویٰ کسی ایک مذہب کی جزئیات پر محدود نہ تھے، بلکہ ہر ایک مذہب کے مطابق جواب دیتے تھے، اور اپنی بالغ نظری اور وسعت معلومات کی بنا پر تمام ائمہ مجتہدین کے بارے میں اپنی مستقل رائے رکھتے تھے، امام محمدؒ، امام ابو یوسف امام مزنی کے بارے میں فرماتے ہیں کہ مزنی کی تفریعات شافعی مذہب کے تابع ہوتی ہیں، وہ امام شافعی کی مخالفت نہیں کرتے، اور امام ابو یوسف اور امام احمد دونوں اپنے استاذ کے اصول کی مخالفت کرتے ہیں،[۲]

امام الحرمین میں تنقید و تحقیق کے جوہر کمسنی سے آشکارا تھے، اسی بنا پر مکمل تقلید ان کو گوارا نہ تھی، فقہی مسائل میں علٰحدہ رائے رکھتے تھے، یہاں تک کہ بیس سال کی عمر میں وہ محققین میں شمار کئے جانے لگے،[۳] امام کے والد شیخ جوینی، صبح کی نماز میں دعائے قنوت میں اس قدر اضافہ کرتے تھے، اللھم لا تعقنا عن العلم بعائق ولا تمنعنا عنہ بمانع لیکن امام اسکو جائز

[۱] عقد الجید [۲] تہذیب الاسماء واللغات [۳] طبقات ۳/ ۲۵۲

نہیں سمجھتے تھے، ایک بار ابوالقاسم السیاری اور امام نے شیخ جوینی کی اقتدا میں نماز فجر ادا کی شیخ نے اس میں قنوت کے ساتھ یہ دعا بھی پڑھی، ابوالقاسم السیاری ایک رکعت کے بعد شریک ہوئے تھے، جماعت کے بعد فوت شدہ رکعت ادا کی اور اس میں قنوت کے ساتھ انھوں نے بھی دعا اضافہ کیا، نماز ختم کرنے کے بعد امام نے ان کو منع کیا، امام کا خیال یہ تھا کہ تعدیلِ ارکان بھی ایک رکن ہے، ماثورہ ادعیہ کے اندر اضافہ سے تعدیل میں طوالت ہوگی، اور یہ صحیح نہیں ہے، سلف کی ایک جماعت ایسی صورت میں نماز کے باطل ہونے کی قائل ہے، غرض یہ مسئلہ مختلف فیہ رہا ہے اور اس بارے میں امام صاحب زیادہ محتاط ہیں، لیکن ابوالقاسم نے اپنی تائید میں شیخ جوینی کا عمل بیان کیا اور امام سے کہا انت تحتاج علی کل احد حتی علی ابیک۔[1]

اس واقعہ سے آغاز شعور سے ہی امام کی بصیرت اور ژرف نگاہی کا اندازہ ہوتا ہے، ابوالقاسم السیاری کے الفاظ بھی تفرداتِ امام کی شہرت کی دلیل ہیں، شیخ جوینی کی جانشینی کے زمانہ میں جب امام کے وسیع مطالعہ کا دور شروع ہوا اور والد کی ہر ہر تصنیف کا انھوں نے بنظرِ غائر مطالعہ کیا تو نہ صرف یہ کہ ان کے تسامحات کی نشاندہی کی بلکہ ان کے خطوط پر قائم نہ رہ سکے، مسائلِ شرعیہ میں اپنی فکر پر مکمل اعتماد کیا، اور علم و تحقیق کے اس بلند منصب پر فائز ہوئے کہ تقلید و انقیاد سے کامل آزاد ہو کر مطلق اجتہاد کا دعویٰ کیا، محققین اور پایہ شناسوں نے امام کے اس دعویٰ میں صداقت کی شہادت دی، ابوالفداء نے کہا کہ امام الحرمین کے اندر اجتہادِ مطلق کے شرائط و ارکان موجود تھے،[2]

واقعہ یہ ہے کہ امام کی علمی جامعیت اور جلالتِ شان کی بنا پر اس سے کسی کو انکار نہیں کہ وہ ان تمام اوصاف و کمالات کے حامل تھے، جو مجتہد مطلق میں پائے جانے ضروری ہیں

[1] طبقات ۳/ ۲۰۹ [2] ابوالفداء ۲/ ۱۹۰

لیکن یہ بھی حقیقتِ مسلمہ ہے کہ اجتہاد بالاستقلال کا دور شاہداتی طور پر ختم ہو گیا، لیل و نہار کی ہزار سالہ گردش میں ایک مجتہد ایسا نہیں پیدا ہوا کہ ائمہ اربعہ کی طرح اس کی مستقل امامت پر پوری امت نے اتفاق کیا ہو اور ہر عہد میں علماء کی ایک جماعت نے اس کے مذہب کی اشاعت کی ہو، شاطبی نے اپنے زمانہ تک کے اس خلاء کو دیکھ کر کہہ دیا کہ اجتہاد بالاستقلال عالم کے موجود رہتے معدوم ہو جائے گا،[1] اور ابن الصلاح اور امام نووی نے کہا کہ مستقل مجتہد کا دور چوتھی صدی میں ختم ہو گیا،[2] چنانچہ امام پر جب یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ اب بناءِ مذہب اور تدوین اصول کی ضرورت نہیں تو انھوں نے شافعی اصول کو تسلیم کیا، اور مقلد ہو گئے، اس طرح فقہ اسلامی کے اندر مذہبِ خامس کی بنیاد تو نہ پڑی لیکن شافعی مذہب کو امام کی ذات سے تائید حاصل ہوئی، اور ان کے اجتہادات نے فقہ شافعی میں وسعت اور نمو پیدا کی۔

امام غزالی پر امام الحرمین کے اثرات

امام غزالی کو اپنے اساتذہ میں جتنی طویل صحبت امام کی میسر رہی اور کسی کی نہیں، طوس سے امام غزالی کے روانہ ہوتے وقت ان کی قابلیت اس حد تک پہونچ چکی تھی کہ وہ طوس کی درسگاہوں کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے تھے، ان کی بے پایاں علمی تشنگی، جس بحرِ بیکراں کی متلاشی تھی وہ نیشاپور میں بہہ رہا تھا، وہ آستانۂ امام پر حاضر ہوئے اور ان کے کعبۂ فضل و کمال کا برابر طواف کرتے رہے، امام کے سفرِ آخرت کے بعد نظامیہ بغداد کے مدرس ہو گئے اس لئے بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ امام غزالی کی اولین تربیت میں امام الحرمین کو مرکزی حیثیت حاصل تھی، خصوصاً مجاہدہ و ریاضت اور ترک و زہد کی عزلت گزینی سے قبل امام غزالی کے فکری ارتقاء میں امام کا اثر کارفرما رہا۔

امام الحرمین کی فقہی تصنیفات میں شافعی مذہب کی تائید و حمایت غیر معمولی ہے، امام نے

[1] الموافقات [2] آداب الفتیا، شرح المہذب

اپنی کتاب "مغیث الخلق فی اختیار الاحق" میں مذہبِ شافعی کو مذاہبِ ثلثہ پر ترجیح دی ہے اور یہ کتنا خلافِ واقعہ نہو گا کہ اس کا پورا پر تو امام غزالی کی "منخول" ہے، اس میں امام غزالی نے استاذ سے بڑھ کر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر نہایت سختی سے حرف گیری کی ہے، یہاں تک کہ امام کے وفی صد مسائل کو غلط قرار دیا ہے، بیان کیا جاتا ہے کہ امام غزالی اپنی یہ کتاب لیکر استاذ کی خدمت میں آئے، مطالعہ کے بعد فرحت و انبساط اور حیرت و استعجاب کے ملے جلے جذبات میں امام کی زبان سے یہ الفاظ نکل پڑے،

دفنتنی وانا حیٌّ ھلاّ صبرت حتی اموت[1] تنے تو مجھکو زندہ درگور کر دیا، میری موت کا انتظار کیے ہوتے، "بعض وقت فرطِ خوشی میں خوردوں کے حق میں بزرگوں کے کلمات تحسین عام متعارف الفاظ سے ہٹ کر ہوتے ہیں، مثلاً کوئی بزرگ اپنے عزیز سے کہے کہ میاں تم نے تو وہ کمال کر دکھایا کہ اب میری ضرورت نہیں، امام کے یہ کلمات اسی قبیل سے ہیں، اصول فقہ میں امام غزالی کی یہ پہلی تصنیف ہے، جو نظامیۂ نیشاپور کے قیام کے زمانہ میں لکھی گئی ہے، امام غزالی نے احیار العلوم میں حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی مدح کی ہے اور ان کی شان میں تعریف کرنے سے اپنی برأت کی ہے، لیکن چونکہ "منخول" میں اس کے بالکل برعکس، امام صاحب کو تعریض کا نشانہ بنایا ہے، اور یہ بات ان کے عام مزاجِ تحریر کے خلاف بھی ہے، اس لئے لوگوں نے اس کتاب کو ان کی فہرستِ تصنیفات سے خارج کر دینا چاہا کہ وہ امام غزالی کی تصنیف نہیں ہے، یا وہ عبارتیں الحاقی ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب امام غزالی کے ابتدائی دور کے خیالات و افکار کی ترجمان ہے اور اس فکر کا آئینہ ہے، جس کی تربیت امام الحرمین کے درس میں ہوئی تھی۔

حضرت امام غزالی اپنے اساتذہ کا ذکر نہیں کرتے، جہاں شیوخ و اساتذہ کا ذکر ناگزیر ہوتا ہے

[1] کنوز الاجداد (ابن کرد) ۲۶۳ - ۲۶۴

وہاں بھی پہلو بچا جاتے ہیں، چنانچہ اپنی سرگزشت حیات میں عبادت و ریاضت، مجاہدہ و مراقبہ کے بیان کے وقت بھی محتاط الفاظ میں یہ کہکر بڑھ جاتے ہیں، کما کنتُ حصلتہ من علم الصوفیۃ[1] مورخین یک زبان ہیں کہ وہ شیخ ابو علی فارمذی کے دست گرفتہ تھے، جس طرح وہ باطنی علوم و کیفیات میں اپنے شیخ کے سپاس گذار نہوئے ظاہری علوم میں بھی استاذ امام الحرمین کو فراموش کر گئے،

حضرت امام غزالی کی کتابِ حیات کا یہ بہت واضح باب ہے، جس سے "سر العالمین" کے ان کی طرف غلط انتساب کا عقدہ کھل جاتا ہے، کیونکہ اس کو لکھنے والے نے جابجا امام الحرمین کا اس انداز سے ذکر کیا ہے، جیسے ایک شاگرد اپنے استاذ کا ذکر کر رہا ہو، مگر چونکہ یہ انداز امام صاحب کی عام عادت کے خلاف ہے، اس لئے یہی امر اس کتاب کے جعلی ہونے کی کافی دلیل ہے،

امام الحرمین نے امام غزالی کی جس انداز سے تربیت کی تھی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ استاذ نے شاگرد کو فقیہ کہا، امام غزالی نے اس کو اپنے لئے سند و اجازت سمجھا اور یہ خیال کیا کہ جلد ہی مسند فقہ و افتا ان کے لئے پابوس ہونے کو ہے، لیکن امام الحرمین نے اس کے بعد ایک بند حجرہ کھولنے کا حکم دیا جو کتابوں سے اٹا تھا، اور فرمایا۔

ما قیل لی یا فقیہ حتیٰ اتیتُ	ان تمام کتابوں کی ورق گردانی کے بعد
علی ھذہ الکتب کلھا[2]	مجھکو فقیہ کہا گیا،

یعنی تفقہ و اجتہاد اس قدر آسان نہیں، جو اس دفتر کو اپنے سینے میں محفوظ کرلے وہ فقیہ ہے، اس واقعہ سے امام الحرمین کے علمی تبحر کے ساتھ ان کے طریقۂ تعلیم اور طلبہ کی تشویق و ترغیب کے نہایت موثر انداز پر روشنی پڑتی ہے،

حلقۂ تدریس علوم و فنون کے اس تابناک و بے مثال عہد میں جب کہ کاروانِ علم کے حدی خوانوں سے

[1] المنقذ من الضلال ص ۲۲ [2] طبقات ۳/۲۵۹

دشت دجبل نغمہ زار ہو رہے تھے، آستانۂ امام پر جبہ سائی کے بغیر علمی سفر نا تمام رہتا تھا، شام کے فقیہ شیخ ابوالفتح نصر مقدسی (م ۴۹۰ھ) جن سے امام غزالی نے دمشق میں علمی استفادہ کیا،[1] اور جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جو بلند مرتبہ ان کو اپنے عہد میں ملا سلف کا زمانہ پاتے تو اُس وقت بھی بے کم وکاست اسی قدر و منزلت کے مستحق ہوتے، ان کے ایک شاگرد بلاد اسلامیہ کی علمی سیاحت کے دوران امام الحرمین کے ہاں آئے اور اس پیکر علم سے اپنے دیدۂ شوق کو روشن کیا۔[2]

امام کا فیضانِ درس شعاعِ آفتاب کی طرح ملک کے گوشے گوشے میں پہونچا اور خراسان کے علاوہ عراق، حجاز، شام اور پوری مملکتِ سلجوقیہ کے امام الحرمین تاجدارِ علم تھے، امام کے قلمرو درس اور سلجوقی حکومت کی سرحدیں ایک دوسرے سے متوازی تھیں، ان کے نامور تلامذہ کے علاوہ وہ علما جو امام کے مدرسہ میں مقیم ہو کر ان کے درس میں شریک ہوتے رہے اور جنھوں نے آپ سے سندِ تلمذ حاصل کیا تھا، ان کی تعداد چار سو ہے، اور یہ تمام لوگ اپنے وقت کے منتخب اور ممتاز علماء ہیں، انہی میں عبدالغافر فارسی ہیں ان کی کتاب تاریخ نیشاپور، طبقات الشافعیۃ الکبریٰ اور دوسری کتب طبقات و تاریخ کا اہم ماخذ ہے، سلاجقہ کی تاریخ بتاتی ہے کہ مذہبی صیغوں اور علمی معاہد پر امام الحرمین کی تیار کردہ جماعت فائز رہی،

سفر اصفہان اور بغداد کا دوسرا سفر

نیشاپور کی مسندِ درس پر امام الحرمین کے جلوس کے ساتھ ہی ساری علمی دنیا ان کی طرف سمٹ آئی اور اس طباشیر صبح میں کواکب و نجوم کی تابانیاں ماند پڑ گئیں، چنانچہ اس شہرت و مقبولیت نے مخالفین کی ایک جماعت پیدا کر دی اور امام کی علمی خدمات میں رکاوٹیں پڑنے لگیں، اس وقت سلجوقیوں کا پایۂ تخت، اصفہان منتقل ہو چکا تھا، اور نظام الملک کا قیام اصفہان میں تھا، امام نے اصفہان کا رخ کیا، نظام جو امام کا نیاز مند تھا، قدیم

[1] شذرات ۳/۲۵۵ [2] طبقات ۳/۲۸

اس نے خیر مقدم کیا وہاں قلیل قیام کے بعد امام نیشاپور واپس آئے،

اسی زمانہ میں شہر دبوسیہ[1] کے ایک جید عالم اور فقیہ سید ابوالقاسم علی بن منظفر دبوسی نیشاپور آئے اور امام کی علمی مجلس میں کسی مسئلہ پر ان سے بحث ہو گئی، اور اس بحث نے ناگوار فضا پیدا کر دی، وہ نیشاپور سے اصفہان روانہ ہو گئے، اتفاق یہ کہ اس کے بعد ہی امام کا سفر ہوا اور اصفہان میں ان دونوں میں مناظرہ ہوا، اصفہان سے مراجعت کے بعد امام، فقہ میں اپنی مشہور کتاب "نہایۃ المطلب فی درایۃ المذہب" کی تصنیف میں مصروف ہو گئے۔[2]

ابن العماد نے امام کے دوبارہ بغداد جانے کا ذکر کیا ہے، لیکن دیگر مؤرخین اور عبدالغافر فارسی جو امام کے شاگرد ہونے کی وجہ سے زیادہ قابلِ اعتماد ہیں، اس سفر کے بارے میں خموش ہیں، ابن العماد کے سہو قلم سے نظامیۂ نیشاپور کی جگہ نظامیۂ بغداد کا ذکر آ گیا ہے، اور نیشاپور کی تدریس، وعظ و خطابت، مذہبی امور کی افسری بغداد کے حالات میں آ گئے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ نظامیہ بغداد سے امام کا تعلق نہیں رہا، یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نظامیۂ بغداد کا وہ منصب جس پر اس عہد کے مشاہیر اور ممتاز علماء فائز ہوتے رہے امام کے لیے کیوں خالی رہا، دراصل امام مدرسہ کی بنیاد پڑنے سے قبل نیشاپور آ چکے تھے، جشنِ افتتاح کے وقت بھی بغداد میں موجود نہیں تھے، اور پھر مستقل قیام نیشاپور میں رہا، یہاں امام کے لیے مدرسہ بنا اس میں بیٹھ کر امام نے ایسی عہد آفریں شخصیتوں کی تعمیر و تشکیل کی جو شیوخِ نظامیۂ بغداد بن کر چمکے، امام کے علمی اخلاف امام غزالی کیا ہراسی اور دوسرے تلامذہ جن کی ایک طویل فہرست ہے وہ نظامیۂ بغداد کے مسند نشین ہوتے رہے،

سلجوقی حکومت میں امام کا منصب اور امور مذہبی کی سرپرستی

دولت سلجوقیہ میں امام کے جیسا اعتماد شاید ہی کسی کو حاصل ہوا ہوگا، اوقاف اور دیگر امور مذہبی کے رئیس تھے تمام مذہبی کام امام کی ہدایات کے مطابق انجام پاتے تھے، پورے ملک سے استفتے ان کے پاس آتے تھے، ان کے فتاوی علماء کے لئے

[1] شہر بخارا اور سمرقند کے درمیان ہے، [2] طبقات الشافعیہ، [3] مراۃ الجنان ۳/۱۱۹

فقہی معلومات کا ذریعہ ہوتے تھے، امام اپنے احکام اور فیصلہ جات کے سامنے شاہی فرامین کو کالعدم کر دیتے تھے[1]، ایک واقعہ سے امام کی حق گوئی اور شخصیت کی عظمت لوحِ دل پر نقش ہو جاتی ہے ،

ایک بار ۲۹ رمضان کی شام کو نیشاپور میں چاند نظر نہیں آیا لیکن بعض شاہی مصاحبوں نے ملک شاہ کو چاند نظر آنے کی خبر دی اور بادشاہ کے فرمان کے مطابق نقارہ بج گیا، اور نغماتِ عید سے شہر گونج اٹھا، چونکہ امام کو عدم رویت کی صحیح خبر تھی، اور یہ اعلان جھوٹی شہادت پر مبنی تھا، امام نے منادی کرا دی کہ آج چاند نہیں دیکھا گیا اس لئے کل ۳۰ رمضان ہے، شاہی اعلان کے بعد بالکل اسکے خلاف امام الحرمین کی طرف سے منادی سنی گئی، اس کے بعد اُن جھوٹی گواہی دینے والوں کو اپنی خیر نظر نہ آئی، ان لوگوں نے ملک شاہ کے پاس پوری شد و مد کے ساتھ امام کے خلاف باتیں پہونچائیں کہ امام حکم شاہی کے خلاف کرتے ہیں اور عوام ان کے اطاعت کیش ہیں، یہ بات سلطنت کے لیے ہرگز خوش آیند نہیں ہو سکتی، ملک شاہ کے غیظ و غضب کے لیے اس قدر کافی تھا لیکن ملک شاہ مذہبی مسائل کا لحاظ کرتا تھا، اس نے امام کو طلب کیا، اُس وقت شاہی ملاقات کے لیے لباس مخصوص ہوتا تھا، امام عام لباس مین پہونچے مصاحبوں نے یہاں بھی بادشاہ کو برانگیختہ کیا کہ امام سادہ لباس مین آئے، ملک شاہ نے حاجب کے ذریعہ دریافت کیا کہ سادہ کپڑے میں کیوں آئے ؟ امام نے اپنی جگہ سے بآوازِ بلند کہا کہ سلطان کو براہ راست مجھ سے دریافت کرنا چاہیے، غرض ملک شاہ سے بالمشافہ گفتگو کی اور فرمایا کہ جس لباس میں میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ مین حاضر ہوتا ہوں اسی لباس میں تمھارے سامنے آیا ہوں، میں اسی کپڑے میں نماز پڑھتا ہوں اور نماز ادا ہو جاتی ہے، اس کے بعد ملک شاہ نے کہا کہ آپ نے میرے فرمان کے خلاف اعلان کر کے میری عدول حکمی کی، امام نے فرمایا کہ جو امور فرمانِ سلطان پر موقوف ہیں، ان کی اطاعت مجھ پر

[1] طبقات (جدید اڈیشن) ج ۵/ ۱۷۰

فرض ہے اس کے علاوہ خالص مذہبی اور شرعی امور فتوی سے متعلق ہیں ان کے بارے میں تم کو مجھ سے معلوم کرنا چاہیے کیونکہ علماء کے فتاوی شاہی احکام کے برابر ہوتے ہیں، روزہ رکھنا اور افطار کرنا یہ فتوی پر موقوف ہے، تم کو اس سے کوئی تعلق نہیں، امام کی اس تقریر سے سلطان کی ناراضی ختم ہو گئی، ملک شاہ نے امام کی جرأت حق گوئی سے خوش ہو کر ان کو عزت و احترام کے ساتھ رخصت کیا، اور دوسرا اعلان کیا کہ میرا فرمان غلط تھا، امام الحرمین کا اعلان صحیح ہے[1]

امام الحرمین اور علم کلام

امام کے زمانہ میں علم کلام کی عمر تین سو برس ہو چکی تھی لیکن اس مین فنی اور علمی حیثیت سے بہت سی خامیاں ابتک باقی تھیں، شروع میں علم کلام کے دو حصے تھے، ایک وہ جو قرآن و حدیث کے نصوص کے ذریعہ اسلامی فرقوں کے شبہات کے ازالہ اور انشراح و اطمینان قلبی کے لیے تھا اور دوسرا وہ جو فلسفہ کے ذریعہ غیر قوموں کی موشگافیوں اور نکتہ چینیوں کے سد باب کے لیے، چوتھی صدی کے آغاز میں امام ابو الحسن اشعری اور امام ابو منصور ماتریدی نے ایک ایسے نئے علم کلام کی طرح ڈالی جس کی اصل نقل پر تھی، لیکن فلسفہ کے بعض اعتراضات کے جوابات بھی شامل ہوئے، اور فلسفہ کی رعایت سے بعض اصول و نظریہ مین تبدیلی آئی مثلاً رویت باری کا مسئلہ کہ اربابِ نقل، رویت کے قائل تھے اس کے ساتھ عرش پر اللہ تعالیٰ کے متمکن ہونے ذو جہت اور قابل اشارہ ہونے کو بھی جائز کہتے تھے لیکن اربابِ عقل، فلاسفہ اور معتزلہ سرے سے اس مسئلہ کے منکر تھے،[2]

رویت باری تعالیٰ پر قرآن ناطق ہے، امام اشعری کا مسلک یہ ہے کہ رویت حق ہے لیکن اللہ تعالیٰ متحیز، ذو جہت اور قابلِ اشارہ نہین ہے، چونکہ عقلی دلائل سے وہ اس کو تسلیم کر چکے تھے کہ تحیز حدوث کا خاصہ ہے، اور خدا حادث نہیں بلکہ ازلی و ابدی ہے،[3] اس طرح وہ ارباب

[1] اخلاق جلالی علامہ جلال الدین محقق دوانی، [2] علم الکلام علامہ شبلیؒ [3] شرح مواقف

نقل کی طرح اللہ تعالیٰ کے دیدار کو حق سمجھتے ہیں، اور فلسفہ کے مطابق لوازم رویت یعنی متحیز، ذوجہت اور قابلِ اشارہ ہونے کا انکار بھی کرتے ہیں، اس مسئلہ سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اشعری کلام، سابق دونوں کلام کے درمیان تھا، امام اشعری اور امام ماتریدی کے قدرے نظریاتی اختلاف سے اس کلام کے بھی دو اسکول ہوگئے، اشعری اور ماتریدی اور تقریباً تمام اہل سنت و الجماعت انہی دونوں کے پیرو ہوگئے۔

اگرچہ عباسیوں کے دور اقبال میں علم کلام کی جو پذیرائی اور عزت افزائی ہوئی بعد کو نہو سکی، لیکن خالص علم و فن کی ترقی کے لحاظ سے اس کے لیے امام کا عہد مبارک مسعود ہے، چوتھی صدی مین علم کلام کے اصول پر قرآن مجید کی تفسیرین لکھی گئیں اور اس کے بعد پانچویں صدی مین ایسے افراد پیدا ہوئے، جنھوں نے اس فن کو غیر معمولی ترقی دی یعنی امام الحرمین، امام غزالی، عبدالکریم شہرستانی، علامہ ابن حزم بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس جماعت نے اپنی تشریحات و توضیحات اور حذف و اضافہ سے اس علم کو مکمل کر دیا تو شاید خلافِ واقعہ نہو گا، کیونکہ اس کے بعد اس فن مین اضافہ نہ ہو سکا، اور آج تک امت کے پاس علم کلام کا جو مفید اور کارآمد سرمایہ ہے، وہ ان ہی اسلاف کا ترکہ ہے۔

امام ابو الحسن اشعری کے وقت میں علم کلام میں فلسفہ کی آمیزش نہیں ہوئی تھی، ابوبکر باقلانی غالباً پہلے شخص ہیں جنھوں نے فلسفہ کے چند مسائل کو کلام میں جگہ دی، مثلاً جوہر فرد ثابت ہے، خلاء ممکن ہے، عرض، عرض کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتا، عرض دو زمانہ تک نہیں رہ سکتا،[1] اور ان کے بعد امام الحرمین نے اس طریقہ کو اختیار کیا، اور اپنی تصنیفات مین فلسفہ کے مسائل کثرت سے بیان کئے، اور خاص اس فن میں ضخیم اور عظیم کتابین لکھیں، ان میں ایک "الشامل" اور

[1] مقدمہ ابن خلدون

اس کی مختصر "الارشاد" ہے، یہ کتاب اپنی افادیت کی بنا پر اس قدر مقبول و متداول ہوئی کہ دو صدی بعد تک نصاب درس میں داخل رہی، امام رازی نے اسکو انہماک اور کامل ذوق و شوق سے پڑھا اور بقول ابن خلکان پوری کتاب حفظ کی،[1] امام صاحب نے اصول فقہ میں اپنی دیگر تصنیفات "البرہان" وغیرہ میں بھی ان مسائل کو بیان کیا۔

علم کلام کے وہ مسائل جن کی حیثیت اصول اور بنیاد کی ہے، ان میں ایک حدوث عالم[2] ہے، یہ مسئلہ وجود صانع اور صانع کے فعل خلق و ایجاد پر دلیل ہے، اس لئے امام الحرمین نے اس مسئلہ کی طرف خاص توجہ کی ہے، اور تمام مسائلِ کلامیہ مین اس کو مقدم رکھا ہے، اپنی ایک کتاب کی ابتداء میں لکھتے ہیں۔

ثم مایقتضیه الترتیب ان	ترتیب مسائل کا اقتضا ہے کہ حوادث کی
نبتدئ الکلام عن الحوادث	بحث سے ابتدا کی جائے اس لئے کہ اللہ
اذ القدیر سبحانه وتعالیٰ	سبحانہٗ تعالیٰ کا علم اضطراری طور پر نہیں
لا یُعلَم اضطرارًا وانما	حاصل ہوتا بلکہ اس کی معرفت نظری
یتوصل الی معرفته نظرًا و	و استدلالی ہے، اور مسئلہ حوادث کے
استدلالًا و سبیل الاستدلال	تام و کمال احاطہ کے بغیر استدلال کا
لا یتضح الا بالاحاطة بالحوادث	طریقہ روشن نہیں ہوتا اس لئے کلام کی
فاقتضی ذٰلك البداية	ابتدا اس بحث سے ناگزیر ہے،
بالکلام علیها[2]	

امام نے اپنی تین کتابون میں اس مسئلہ کو اشعری مذہب کے مطابق بیان کیا ہے اور اسکی

[1] ابن خلکان ۲/ ۲۶۲ [2] الجوینی ۱۳۳ ڈاکٹر فوقیہ،

مکمل تائید کی ہے، اس کے علاوہ "العقیدۃ النظامیہ" میں بھی انھوں نے نئے انداز سے اس پر بحث کی ہے،
اس کو سمجھنے کے لیے پہلے فلاسفہ، معتزلہ و اشاعرہ کے نظریات مختصراً معلوم کر لینا مناسب ہوگا۔

اکثر فلاسفہ قدم عالم کے قائل ہیں، ان کے نزدیک موجودات کی اصل ہیولیٰ ہے، جو قدیم مادہ ہے، اور اس مادہ سے عالم کا وجود اسی طرح ہوا ہے، جس طرح علت سے معلول موجود ہوتا ہے، اس لئے قدیم الاصل ہونے کی بنا پر عالم قدیم ہوا اور بعض فلاسفہ کے نزدیک عالم کی اصل ہیولیٰ کے بجائے دوسری چیزیں مثلاً آفتاب، زمانہ وغیرہ ہیں، لیکن قدیم ہونے کا مفہوم تمام فلاسفہ کے نزدیک مسلم ہے،

اہل حق یعنی اشاعرہ اور ماتریدیہ، موجودات کو قدیم نہیں، بلکہ حادث کہتے ہیں، اور حادث کے معنی ان کے یہاں کسی چیز کا عدم سے وجود میں آنا ہے، پس جس چیز کا کسی زمانہ میں وجود نہیں تھا، اب موجود ہو گئی تو وہ حادث ہوئی نہ کہ قدیم، وہ موجودات کے لئے کوئی اصل قدیم نہیں مانتے بلکہ عدم محض سے وجود کے قائل ہیں، ان کے نزدیک موجودات کی دو قسم ہے، عرض اور جوہر اور یہ دونوں حادث ہیں جو اللہ تعالیٰ کی تخلیق کے سے وجود میں آئے، حاصل کلام یہ ہے کہ فلاسفہ کے ہاں عالم قدیم ہے، اور اہل سنت والجماعت کے نزدیک حادث،

امام ابوالحسن اشعری حدوث عالم کے ثبوت کے لئے آفاق و انفس اور وجود انسانی سے مثال دیتے ہیں کہ انسان کو ہم پہلے کمسن بچہ پھر جوان اور ایک عرصہ کے بعد بوڑھا دیکھتے ہیں، وہ اپنے بچپن سے پیری کی عمر تک اپنی مرضی اور کسب و ارادہ سے نہیں پہونچا، اگر ایسا انسانی اختیار سے ممکن ہوتا تو وہ بوڑھا اپنی جوانی اور بچپنے کو پھر پلٹ آئے لیکن ابتدائے آفرینش سے آج تک ایسی کوئی مثال نہیں ملتی، اس سے معلوم ہوا کہ ہم سے مخفی مگر ہم سے بہت قریب ایک ایسی قادر مطلق اور مختار کل ذات ہے، جس کی کرشمہ سازی سے گردش لیل و نہار اور کائنات کے تمام کام ظہور پذیر ہیں، اس تمثیل سے امام اشعری نے انسانی عجز و درماندگی کے ذریعہ عالم کا حدوث اور اللہ تعالیٰ کی خالقیت

وصانعیت دونوں باتیں ثابت کر دی ہیں،

عالم کے لغوی معنی "الخلق کلہ" یا ما حواہ بطن الفلک" ہے، مگر قدیم متکلمین کی اصطلاح کے مطابق ذات واجب الوجود کے سوا سارے موجودات کو عالم سے تعبیر کیا جاتا ہے، "الکل موجود سوی اللہ تعالیٰ" اور متاخرین نے اس کی تعریف جوہر اور عرض سے کی ہے، متقدمین و متاخرین کی ان تعریفات میں کوئی معنوی اختلاف نہیں ہے، کیونکہ تمام موجودات کا وجود کسی ایک وجود بخشنے والی ہستی کا محتاج ہے، اور جواہر و اعراض بھی ایسے ہی موجودات و محدثات ہیں،

امام الحرمین نے اپنی جن چار کتابوں میں حدوث عالم کا مسئلہ بیان کیا ہے ان کے نام یہ ہیں،
(۱) لمع من الادلۃ فی قواعد عقائد اہل السنۃ والجماعۃ (۲) الارشاد الی قواطع الادلۃ فی اصول الاعتقاد" (۳) الشامل فی اصول الدین (۴) العقیدۃ النظامیۃ، اول الذکر تین تصنیفات کا مقصد فلاسفہ اور معتزلہ کی تردید اور اشاعرہ کی تائید و حمایت ہے، چنانچہ کتاب اللمع اور الارشاد میں عالم کے اصطلاحی معنی متکلمین کی دونوں جماعتوں قدماء و متاخرین کے نقطۂ نظر کے مطابق اس طرح بیان کرتے ہیں،

العالم هو كل موجود سوى الله	اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے علاوہ
تعالیٰ وصفة ذاته، ثم العالم	کل موجودات عالم ہیں اور عالم جواہر
جواهر واعراض۔	و اعراض بھی ہیں،
ما العالم ولم سمی العالم عالماً	اگر یہ سوال کیا جائے کہ عالم کیا ہے؟
قلنا العالم عند سلف الامة	اور اس کی وجہ تسمیہ کیا ہے تو یہ جواب
عبارة عن كل موجود سوى	دیا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا تمام
الله تعالیٰ وعند خلف الامة	موجودات کو سلف کے نزدیک عالم کہتے ہیں،

عبارۃ عن الجواھر والا — اور خلف کے ہاں جواہر و اعراض کا نام

عراض ؎ — عالم ہے،

علم کلام کے مصطلحات شئی، موجود، جوہر اور عرض کی بحث میں معتزلہ اور فلاسفہ کی پوری تردید کی ہے،

عالم کی تعریف امام کے الفاظ میں — امام نے عالم کی نئی تعریف اپنے الفاظ میں یوں کی ہے،

اجسام محدودۃ متناھیۃ — محدود اور اختتام پذیر اجسام

المنقطعات

یعنی عالم ایسے موجودات کا نام ہے، جو ظاہری و محدود حجم و جسم والے ہیں ان کی مختلف شکلیں اور صورتیں ہیں، اس تعریف سے امام نے عالم کو ظنیات سے ہٹا کر ہمارے محسوسات اور مشاہدات کے ساتھ خاص کر دیا ہے، اور عرض کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے،

واعراض قائمۃ بھا کالوانھا — اور اعراض جسم کے ساتھ قائم ہیں جیسے

وھیئاتھا فی ترکیبھا وسائر — رنگ اور اجزائے ترکیبی کی ہیئتیں اور

صفاتھا۔ — دیگر صفات۔

عرض کے لیے اہل حق کی اس اصطلاح کہ "جوہر سے علیحدہ اس کا کوئی حیز نہیں" کو امام صفات متغیرہ کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، ان کی اس تعریف کی بنا پر وہ موجودات عینی جن کی معرفت ہمارے ظاہری حواسِ خمسہ کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے، عالم ہیں اور عالم کی کنہ کی دریافت کے لیے ہم دقت نظر کے محتاج نہیں، کیونکہ عالم ہم اور ہمارے گرد وپیش کی مخلوقات ہیں، چونکہ تمام موجودات تغیر پذیر ہیں، اس لئے امام کے نزدیک عالم جائز ہے، واجب نہیں، اس وقت کائنات جس نظم و ضبط کے ساتھ قائم ہے، کسی وقت میں وہ بالکل درہم برہم ہو سکتی ہے،

سلہ الجوینی ۱۲۲

مجوز غیر ممتنع تقدیرہ علی — عالم اس وقت جس ہیئت پر ہے،

خلاف ماھو علیہ — اس کے خلاف ہونا ممتنع نہیں ہے،

اور یہ تغیرات از خود نہیں ہوتے بلکہ کسی فاعل کے فعل کا نتیجہ ہیں اور وہ فاعل مرید و مختار اور قادر مطلق ہے وہ اپنے ہر ارادے اور مشیئت کو وجود بخشنے پر پوری طرح قادر ہے، وہ فعال لما یرید ہے، اور اس کی عقلی دلیل یہ ہے کہ

لان الموجب الذی لا یوثر — اگر خالق و موجد غیر مؤثر ہے تو

یستحیل ان یقتضی شیئاً دون — اپنے سے کمتر چیزوں کی تخلیق کا ارادہ

مماثلہ ؎ — کرنا اس کے لئے محال ہے،

امام نے اشاعرہ کی حمایت میں مذہب اشعری کے تتبع کے ساتھ اپنی طرف سے جدید اصطلاحات وضع کر کے اور نیا انداز فکر پیدا کر کے اس کے کلام کو آسان اور وسیع کر دیا، لیکن چونکہ یہ خالص علمی و فنی مباحث ہیں جن سے عموماً علماء واقف ہوتے ہیں، اور عام لوگوں کو ان سے کم دلچسپی ہوتی ہے، اس لیے اب مزید تفصیل غیر ضروری ہے، (باقی)

سلہ الجوینی بحوالہ العقیدۃ النظامیہ،

کراچی کا ایک مکتوب

کراچی، ۱۰ نومبر ۱۹۷۸ء

حضرت سید محترم! معارف سے معلوم ہوا کہ آپ کو حکومت نے علمی خدمات کی بنا پر ایوارڈ دیا ہے، ہر چند کہ آپ اور آپ کی حیثیت بہت بلند و بالاتر ہے، ان بیساکھیوں کی قطعاً ضرورت نہیں، لیکن پھر بھی زمانہ کا دستور ہے، سو وہ پورا ہوا، بہت اچھا ہوا! میری طرف سے دلی مبارک باد قبول فرمائیے۔

سید صاحب! اب تو آپ کی زیارت کو بہت جی چاہتا ہے، میں اس روز کو ترستا ہوں جب آپ اچانک تشریف لے آئیں، اور آپ کو گلے لگا لوں، میرا ایک آپریشن گلے کا ہوا، الحمد للہ اب بہت ٹھیک ہوں، یہ چھوٹا آپریشن تھا، دعا فرمائیں کہ رب العزت اس مرض سے نجات عطا فرمائے، آمین!

بزم تیموریہ جلد دوم ایرمیل سے فوراً بھجوا دیں، دو تین کتابیں چھپی ہیں، جو عنقریب خدمتِ اقدس میں روانہ کر دی جائیں گی ایک تذکرہ "مجمع الشعرائے جہانگیری" آپ کی بزم تیموریہ کی دوسری جلد میں کام آتا۔ کاش کہ چھپنے سے پہلے آپ کے ملاحظہ سے گذرتا، آپ کب تک ایک بار پھر کراچی تشریف لا رہے ہیں، لکھئے،

والسّلام حسام الدین راشدی

معارف:۔ جناب سید حسام الدین راشدی صاحب دار المصنفین کے بڑے قدردان اور پاکستان کے حلقۂ علم کے جلیل القدر مصنف ہیں، دار المصنفین اور حکومت پاکستان میں یہاں کی مطبوعات کے کاپی رائٹ کے فروخت کا جو معاہدہ ہوا تھا، اس میں آپ کا بہت ہی اہم کردار رہا، دعا ہے اللہ تعالیٰ اُن کو صحت کاملہ کے ساتھ بہت دنوں تک بقید حیات رکھے تاکہ وہ علم کی خدمت کرتے رہیں اور دار المصنفین سے بھی اُن کی دلچسپی اور عقیدت باقی رہے، آمین،

ادبیات

غزل

جناب نسیم احمد نسیمؔ، ایڈووکیٹ، شاہ جہاں پور

کون کہتا ہے کہ یہ غم سے اماں مانگے ہے
حادثے اور مرا عزمِ جواں مانگے ہے

کون توڑے گا مرے دوست اسے تیرے سوا
شیشۂ دل ہو کہ پھر سنگِ گراں مانگے ہے

میں ہوں اس دور کا منصور چڑھا دو سولی
دار پھر سنتا ہوں نذرانۂ جاں مانگے ہے

بے گناہی ہے کہ ہر در پہ صدا دیتی ہے
دستِ قاتل ہو کہ شمشیر و سناں مانگے ہے

زندگی کس نے تیری سمت اسے پھینکا ہے
نشترِ غم ہو کہ خونِ رگِ جاں مانگے ہے

کل جو ڈوبا تو کوئی پوچھنے والا بھی نہ تھا
آج اُبھرا ہوں تو ہر موجِ رواں مانگے ہے

اس سے کہنا ہے حدیثِ غمِ دل مجھ کو نسیمؔ
آرزوئے دلِ بیتاب زباں مانگے ہے

غزل

از جناب محمد حسین فطرتؔ بھٹکلی

اگر عزمِ سفر دل میں ترے بیدار ہو جائے
تری راہوں کا ہر کانٹا گل و گلزار ہو جائے

یہ اک زندہ صداقت ہے یہ اک روشن حقیقت ہے
نہ ہو مرنا تو پھر جینا یہاں دشوار ہو جائے

مجھے ہر رات بیداری کا اک پیغام دیتی ہے
ہو خوابیدہ زمانہ تو یہ دل بیدار ہو جائے

مرے دل نے حجابِ رازِ ہستی چاک کر ڈالا
یہی تھا اس کے شایاں محرمِ اسرار ہو جائے

نگاہِ مردِ مومن کی خصوصیت یہی تو ہے
کبھی یہ برگِ گل ہو تو کبھی تلوار ہو جائے

شرابِ عشق کی تاثیر کا منکر ہے کیوں واعظ
عجب کیا ایک میکش محرمِ اسرار ہو جائے

مصفّٰی اور مجلّٰی نور ساماں اور بلوریں
ترا دل بھی مثالِ ساغرِ گلنار ہو جائے

نگاہِ یار کی تعریف کن لفظوں میں ہو فطرتؔ
یہ تیرِ نیم کش ہے کیوں جگر کے پار ہو جائے

باب التقریظ والانتقاد

مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی رح پر ایک اہم کتاب

تقریباً بیالیس سال پہلے کی بات ہے کہ اس راقم نے اپنی کتاب بزم صوفیہ کے سلسلہ میں مکتوبات امام ربانی کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی، اس کے کچھ حصے سمجھ میں نہیں آئے تو استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی رح کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے سمجھنے کی کوشش کی، انھوں نے کچھ دیر تک سمجھایا، پھر یہ کہہ کر کتاب رکھ دی کہ مولانا عبد الباری ندوی (مرحوم) تشریف لانے والے ہیں، وہ فلسفی بھی ہیں، اور صوفی بھی، اس لیے وہ اچھی طرح سمجھا دیں گے، اس وقت تک حضرت استاذی المحترم تھانہ بھون جا کر بیعت نہیں ہوئے تھے، مولانا عبد الباری ندوی (مرحوم) تشریف لائے تو ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے مکتوبات ربانی کو سمجھانے کی گذارش کی، فرمایا میں کس چکر میں پڑ گیا ہوں، انکو بھی یہ مکتوبات خود سمجھ میں نہیں آئے تو مولانا اشرف علی تھانوی رح کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے سمجھنے کی کوشش کی، وہ سمجھانے لگے تو کچھ سمجھ میں نہ آیا، ان سے عرض کیا کہ وہ ان مطالب کو تحریر فرما دیں تاکہ ان کو وہ بار بار پڑھ کر سمجھ سکیں، خوشی کی بات ہے کہ ان مکتوبات کے غوامض و حقائق کو مولانا ابو الحسن علی ندوی نے بڑی خوبی کے ساتھ اپنی کتاب تاریخ دعوت و عزیمت جلد چہارم میں سمجھانے کی کوشش کی ہے، جو مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی قدس سرہٗ کے حالات و تعلیمات پر مشتمل ہے، اس کے مندرجۂ ذیل ابواب سے پوری کتاب کی نوعیت کا اندازہ ہوگا،

باب اول، عالم اسلام دسویں صدی میں، باب دوم اکبری عہد حکومت اور اس کے دو متضاد دور، باب سوم حضرت مجدد الف ثانی رح، حالات زندگی از ولادت تا خلافت، باب چہارم اہم واقعات و حالات، ارشاد و تربیت کی سرگرمی، وفات باب پنجم حضرت مجدد رح کے دائرۂ تجدید کا مرکزی نقطہ نبوت محمدی پر ایمان و اعتماد کی تجدید، باب ششم وحدۃ الوجود یا وحدۃ الشہود، باب ہفتم اکبر سے جہانگیر تک، سلطنت کو راہ راست پر لانے کے لیے آپ کی خاموش جد و جہد، باب ہشتم حضرت مجدد رح کے دو خلفائے کبار اور ان کے منتسبین کے ذریعہ آپ کے تجدیدی کام کی توسیع و تکمیل۔

ان ابواب سے ظاہر ہوگا کہ حضرت مجدد الف ثانی رح کے عہد اور ان کے حالات و تعلیمات پر اس کتاب میں وہ سب کچھ ملیگا جو اب تک معلوم تھا، اور وہ بھی جو اب تک معلوم نہ تھا، حضرت مجدد رح پر اردو اور انگریزی میں اس ملک اور بیرون ملک بہت کچھ .... لکھا جا چکا ہے، لیکن مولانا ابو الحسن علی ندوی کی کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ادب بھی ہے، انشا پردازی بھی ہے تحقیق بھی ہے، حقیقت پسندی بھی ہے، اور مصنف کے دل کی سرشارانہ کیفیت بھی ہے، اور ناظرین کے سکینت قلب کا کافی سامان بھی ہے، اسکو پڑھتے وقت کبھی ادب و انشا کی لذت ملتی ہے، کبھی گہری تحقیقات کی داد دینی پڑتی ہے، کبھی تاریخ کی گتھیاں سلجھتی دکھائی دیتی ہیں، کبھی راہ سلوک کی منزلیں طے ہوتی نظر آتی ہیں،

اس کتاب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی رح سے پہلے دسویں صدی ہجری میں عالم اسلام میں جو سیاسی، علمی، مذہبی اور روحانی تحریکیں چل رہی تھیں ان کا بھی اس کتاب میں جائزہ لیا گیا ہے پھر اکبر کے عہد حکومت میں جو مذہبی اور روحانی فتنے اٹھے، ان پر بھی ناقدانہ تبصرہ ہے، ان کے مطالعہ کے بعد حضرت مجدد رح کے تجدیدی کارناموں کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی، ان ابواب کو پڑھتے وقت ٹھہر کر یہ سوچنا پڑتا ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کی مختلف تحریکیں ان کو کس سمت لے جا رہی تھیں، ان تحریکوں نے انکے معاشرے یا ذہن کو سنوارا یا ان کو بگاڑ کر ان کو انتشار کی طرف لے گئیں، مثلاً اس کے پہلے باب میں شطاریہ

سلسلہ کا ذکر آگیا ہے، جس کے مشہور بزرگ شیخ محمد غوث گوالیاری کے حالات میں ہے کہ ان کی جاگیر کی آمدنی نو لاکھ سکہ نقرئی تھی، ان کے فیل خانہ میں چالیس ہاتھی تھے، خدم وحشم کا بھی ایک بڑا لشکر تھا، وہ بازار میں نکلتے تو ٹھٹھ لگ جاتے، اس کے باوجود ملک میں ان کے فقر کی دھوم مچی ہوئی تھی، (ص ۳۶ - ۳۵) انکے ذکر میں یہ بھی ہے کہ اس سلسلہ نے پہلی مرتبہ جوگ کو تصوف کے ساتھ ملایا، اور اس کے بعض طریقے اور اذکار اور بعض آسن اور حبس دم کا طریقہ اختیار کیا (ص ۳۴) آگے چل کر یہ بھی ہے کہ شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کی مقبول کتاب جواہر خمسہ کی بنیاد زیادہ تر بزرگوں کے اقوال اور اپنے تجربات پر ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحیح احادیث سے ثابت ہونے یا معتبر کتب شمائل وسیر سے اخذ کرنے کو ضروری نہیں سمجھا گیا (ص ۲۴۴)

ان کو پڑھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر تصوف میں جوگ آسن اور حبس دم کے طریقے ملائے گئے تو کیا اس کو اسلامی تصوف کہنا صحیح ہوگا، پھر شطاریہ سلسلہ میں جو چیزیں اختیار کی گئیں کیا وہ چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں کے یہاں بھی تھیں، اور اگر نہیں تھیں تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس سلسلہ کے بزرگوں نے صاحب ولایت چشتیہ سے اس ملک کا روحانی چارج لیا (ص ۴۴) اور اگر انھوں نے واقعی سارے ہندوستان کو تسخیر کرلیا (ص ۴۴) تو کیوں اور کیسے؟ کیا اس زمانہ کے لوگ درویشی میں امارت چاہتے تھے، اور اپنے ہم وطنوں سے قریب ہونے کی خاطر ان کے روحانی کمالات میں حصہ دار بننا چاہتے تھے، اور وہ واقعی اس کے خواہاں تھے تو پھر شطاریہ سلسلہ آگے چل کر کیوں اتنا مقبول نہیں رہا، جتنا کہ دسویں صدی میں تھا، پھر شیخ محمد شطاری کی تصنیف "کلید مخازن" میں جو وحدت الوجود پیش کیا گیا ہے وہ کیا وہی وحدت الوجود ہے، جس کو شیخ راجح بن داؤد گجراتی، شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور حضرت خواجہ باقی باللہ نے پیش کیا ہے، مولانا ابوالحسن علی ندوی نے یہ بحث چھیڑ کر اس کی دعوت دی ہے کہ اس سلسلہ کا مطالعہ اس نوعیت کے ساتھ بھی کیا جائے،

دسویں صدی ہجری میں مسلمانوں کی ذہنی بے چینی اور اعتقادی انتشار خیال سے بھی بحث کی گئی ہے، بلوچستان کے فرقہ ذکری کو خلاف اسلام بتایا گیا ہے، (ص ۴۹) گو اس کے محرکین مسلمان ہی تھے، اسی طرح فرقہ روشنیہ کو انتشار پسندوں میں شمار کیا گیا ہے، جو پشاور کے قبیلوں اور مہمند زیوں، سندھیوں اور بلوچیوں میں ضرور پھیلا، مگر نہ صرف اکبر بلکہ علماء کی شدید مخالفت کی وجہ سے تتر بتر ہوگئے، اور بالآخر ناپید ہوگئے، (ص ۵۰)

محمد جونپوری کی تحریک کا ذکر انتشار پسندی ہی کے سلسلہ میں کیا گیا ہے، مگر اس کو زلزلہ انگیز بھی کہا گیا ہے، (ص ۵۲) ان کی تحریک مہدویت کے نام سے مشہور ہوئی گو خود محمد جونپوری نے اپنے کو مہدی وقت نہیں کہا، ان کے غالی متبعین نے ان کو مہدی ہی تسلیم کرلیا، بلکہ ان کو انبیاءؑ کا ہمسر اور بعض سے افضل و برتر بنادیا، (ص ۵۵) اس کے پیروؤں نے افغانستان اور ہندوستان میں کئی سلطنتیں قائم کرلیں، مگر راسخ علماء اس تحریک کے شدید مخالف ہوکر اسکو گمراہی اور ضلالت ہی قرار دیتے رہے، اس لیے اس کے اثرات رفتہ رفتہ کم ہوتے گئے،

ان فرقوں کے وجود میں آجانے سے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ انتشار پسند فرقے کیوں پیدا ہوتے گئے؟ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اس کے کچھ اسباب بتائے ہیں، ایک سبب تو یہ بتایا ہے کہ معاشرہ کے قول وعمل، عقیدہ اور زندگی میں جب مطابقت نہیں ہوتی تو بے اطمینانی پیدا ہوجاتی ہے، پھر تشکک پیدا ہونے لگتا ہے، جس کے بعد انتہا پسندی میں دینی تعلیمات بالائے طاق رکھ دی جاتی ہیں، اور کوئی تحریک چلا کر اس میں پناہ لی جاتی ہے، پھر جب سلاطین وقت احکام شریعت سے چشم پوشی کرنے لگتے ہیں تو پھر کچھ لوگ انقلابی تحریک کے نام پر بغاوت پر آمادہ ہوجاتے ہیں، دوسرا سبب یہ بتایا ہے کہ جب نظام تعلیم بے روح ہوجاتا ہے تو لوگ ایسی تحریکوں میں اپنے ذہن کی تسکین پانے لگتے ہیں، مولانا نے ان اسباب کی نشاندہی مختصر طریقے پر

کر کے اس کی دعوت دی ہے کہ مسلمانوں کے دور میں جو مختلف مذہبی تحریکیں چلیں ان کے اسباب و علل کا مطالعہ تفصیل سے کیا جائے، تاکہ آیندہ مسلمانوں کی اس قسم کی تحریکیں اٹھیں تو ماضی کے تجربات کی بنیاد پر ان کے روشن اور تاریک پہلوؤں پر ان کی نظر رہے،

اسی باب میں ایران کی نقطوی تحریک کا بھی ذکر ہے جو بالکل ملحدانہ تھی، اس کی مختلف شکلیں مزدک، مانی، اور حسن بن صباح کی تحریکوں میں ابھریں، یہ سب ایران سے اٹھیں، مولانا نے یہ سوچنے کی دعوت دی ہے کہ آخر ایران کی سرزمین ملحدانہ تحریکوں کے لئے کیوں سازگار ہوتی ہے؟ ان کے ماننے والوں کی تعداد میں کیوں اضافہ ہو جاتا ہے؟ ان کے پیرو ان کی طرف نیک نیتی یا دینی سادہ لوحی میں مائل ہو جاتے ہیں؟ یا ان تحریکوں کے چلانے والے ایسے ریاکار اور فریبی ہوتے ہیں کہ ان کی طرف مائل ہونا ناگزیر ہو جاتا ہے؟ جب ہم اسی کتاب میں یہ پڑھتے ہیں کہ شاہ عباس صفوی نے ہزاروں نقطویوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ تاریخ کا یہی فیصلہ ہے کہ مسلمانوں میں جب ملحدانہ تحریکیں چلائی جائیں گی تو اس کا حشر یہی ہوگا،

ابو الفضل کو تاریخ عالم آرائے عباسی کے حوالے سے نقطوی قرار دیا گیا ہے، (ص ۶۹) مگر میرا اپنا خیال ہے کہ وہ کچھ بھی نہ تھا، اور تھا تو اکبر کا بہت بڑا مزاجدار، خود مولانا نے بھی لکھا ہے کہ اس نے اپنے علم و ذہانت سے کام لے کر بادشاہ کی خواہشات کو علمی جامہ پہنانے اور اس کو علمی اسلحہ فراہم کرنے اور فرمانروائے سلطنت کی سطح سے زمام زمان اور ہادی دوران کے منصب رفیع تک پہونچانے میں جو کردار ادا کیا تھا، اس پر اس کا ضمیر مطمئن نہیں تھا، اور وہ خود اپنے ایک خط میں جو خانخاناں کو لکھا ہے اس کا اعتراف کرتا ہے کہ وہ مشاغل لایعنی کے جہنم میں پھنس کر بندۂ فطرت ہو گیا، اور اس کے قریب پہونچ گیا کہ خدا کی بندگی کے بجائے بندۂ درہم و دینار کہا جانے لگا، (ص ۱۰۱)

اکبر کے مذہبی مزاج کی تبدیلی کی ذمہ داری مولانا نے درباری علما پر ڈالدی ہے، انھوں نے ایک عربی شعر لکھ کر یہ واضح کیا ہے کہ اگر سلاطین مذہبی ذہن کو اپنے مفاد کی خاطر بگاڑتے ہیں تو علمائے

سوٗ اور دنیادار زاہدوں نے بھی اس کو بہت کچھ بگاڑا ہے، درباری علما پر اکبر کے مذہبی انحراف کی ذمہ داری ڈال کر مولانا نے ان غیر عالم مورخوں کی تائید بڑی حد تک کر دی ہے، جو اس قسم کی باتیں برابر لکھتے آئے ہیں، اس باب کا سب سے اہم حصہ وہ ہے جس میں اکبر کے دین الٰہی کی پوری تصویر ابو الفضل کی تحریروں سے دکھائی گئی ہے، اب تک دین الٰہی ملا عبد القادر بدایونی کی تحریروں کے ذریعہ سے سمجھا جاتا تھا، مگر ان کی تحریروں کو یہ لکھ کر مجروح کیا جاتا ہے، کہ یہ ایک متعصب اور انتہا پسند کی ہیں جو زیادہ قابل اعتماد نہیں، حالانکہ انھوں نے خدا کی قسم کھا کر لکھا ہے کہ انھوں نے اکبر کے مذہبی خیالات کے بارہ میں جو کچھ قلمبند کیا ہے، اس میں ملامت، نفرت، حسد اور تعصب کا جذبہ نہیں، بلکہ صرف شرع متین اور دین متین کی حمایت ہے، (منتخب التواریخ جلد دوم ص ۲۰۵) مگر آئین اکبری کے گہرے مطالعہ کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ابو الفضل اور ملا عبد القادر بدایونی نے جو کچھ لکھا ہے، اس میں کچھ زیادہ فرق نہیں، صرف اسلوب بیان کا فرق ہے، آئین اکبری میں اکبر کے خود ساختہ مذہب کی تفصیلات ایسی مشکل اور مغلق عبارت آرائیوں میں قلمبند کی گئی ہیں کہ ان کا سمجھنا آسان نہیں، اس لئے وہ نظر انداز کر دی جاتی تھیں

اب مولانا ابو الحسن علی ندوی نے اکبر کی ایسی تمام تحریروں کے ٹکڑوں کو ایک ساتھ جمع کر کے اردو میں ان کے ترجمے بھی دیدیے ہیں، ان کے مطالعہ کے بعد موجودہ دور کی سیکولرزم میں اس مذہب کی خوبیاں جا ہے جتنی بیان کی جائیں، لیکن یہ دین الٰہی دراصل تباہی دین کے سوا کچھ بھی نہ تھا، مولانا کی نظر اکبر نامہ پر بھی پڑی ہوگی، شاید طوالت سے بچنے کی خاطر اس میں اکبر کے عبادت خانہ کے مباحث کا جو ذکر ہے اسکی تفصیل لکھنا پسند نہ کیا ہو، اسی اکبر نامہ میں ہے کہ اکبر نے ۲۵ ویں سال جلوس میں خداشناسی کی خاطر کچھ ضابطے مقرر کئے جن میں کچھ یہ ہیں، سال کے بارہ حصے ہیں، اس لئے سچقان آئیل میں، جو بہ نہ مارے جائیں اعلان آئیل میں سانپ نہ مارے جائیں، تخاقو آئیل میں مرغ نہ ذبح کئے جائیں اور نہ وہ لڑائے جائیں، ایت آئیل میں کتے جیسے وفادار جانور سے دوستی کا ثبوت دیا جائے، تینگو آئیل میں سوروں کو تکلیف

نہ پہونچائی جائے، جمادی الآخر میں چمڑا نہ استعمال کیا جائے، محرم میں جانور کو نہ ماریں (اکبر نامہ جلد سوم، ص ۳۲۲-۳۳۳)۔

ان ضابطوں کے بعد اکبر کے مذہب اور اس کی خداشناسی کے مضحک ہونے میں کیا شبہہ رہ جاتا ہے، مولانا کی اس رائے سے اتفاق کرنا صحیح ہوگا کہ مذہب کی حیثیت ایک زنجیر آتشیں کی تھی جو اس وقت اسلام کے گلے میں ڈال دی گئی تھی، (ص ۱۰۸) ابو الفضل نے اکبر کے کارناموں کو بیان کرکے اسکو اکبر اعظم ضرور بنا دیا، لیکن اکبر کے دین الٰہی کی جب پوری تفصیل ابو الفضل ہی کی زبانی سمجھی جائے گی، تو اکبر اعظم کے دین الٰہی کو ایک فتنۂ اعظم سمجھنے پر ناظرین مجبور ہونگے،

اسی فتنۂ اعظم کے مضرت رساں اثرات کے انسداد کے لئے حضرت شیخ احمد سرہندیؒ اٹھے، جو بعد میں مجدد الف ثانی کے نام سے مشہور ہوئے، ان کی زندگی کے اہم ترین واقعات میں سے ایک جہانگیر کے حکم سے ان کی اسیری بھی ہے، راقم ایک عرصہ دراز سے اس واقعہ پر جتنا غور کرتا ہے، یہ ایک عقدہ لاینحل نظر آتا ہے، جہانگیر اپنے چودھویں سال جلوس میں ان کے بارہ میں لکھتا ہے،

"ان ہی دنوں مجھ سے عرض کیا گیا کہ شیخ احمد ثانی ایک جعل ساز (شیادے) نے سرہند میں مکر وفریب کا جال بچھا کر بہت سے ظاہر پرستوں کو پھانس رکھا ہے، اس نے ہر شہر اور ہر علاقہ میں ایک خلیفہ مقرر کر رکھا ہے، جو دوکانداری، معرفت فروشی اور مردم فریبی میں بہت پختہ ہیں، اس نے اپنے مریدوں اور معتقدوں کو بہت سے خرافات لکھے ہیں، ان کو ایک کتاب میں جمع کر دیا ہے اور نام مکتوبات رکھا ہے، اس میں بہت سی مہمل اور لاطائل باتیں ہیں جو کفر کی حد تک پہونچتی ہیں،

اسی سلسلہ میں وہ لکھتا ہے،

"ایک مکتوب میں لکھا ہے کہ میں سلوک کی راہ میں ذی النورین کے مقام سے گذرا جو نہایت اونچا اور پاکیزہ تھا، اس سے گذر کر مقام فاروق میں پیوست ہو گیا، اور مقام فاروقی سے

گذر کر مقام صدیق کو عبور کیا، ہر مقام کی تعریف اس کے مطابق کر کے لکھا ہے، .... اس طرح کی اور گستاخانہ باتیں لکھی ہیں، ...."

تزک جہانگیری کی یہ عبارتیں مولانا نے قصداً اپنی کتاب میں نقل کرنا پسند نہیں کیا ہے، شاید ان کی ثقاہت اور متانت نے اس کو نقل کرنے سے ابا کیا ہو، صرف اتنا لکھنے پر اکتفا کیا ہے کہ مجدد صاحب کا ذکر جہانگیر نے بہت نامناسب انداز اور کسی قدر تحقیر آمیز طریقہ پر کیا ہے، (ص ۱۵۰)

تزک جہانگیری کی مذکورۂ بالا عبارتوں کو نظر انداز کرنے کے بجائے ان کا ناقدانہ مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے، اور راقم کو جہانگیر کے قلم سے ایسی عبارت کا لکھنا قابل یقین نہیں معلوم ہوتا، کیا وہ چودہ سال تک حضرت مجدد الف ثانیؒ کی دعوت وعزیمت کی سرگرمیوں سے بے خبر رہا؟ شہزادہ خرم کو حضرت شیخ احمد سرہندیؒ سے عقیدت تھی، خود مولانا بھی تحریر فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہجہان کے دل میں ہمیشہ حضرت مجددؒ کے لیے نرم گوشہ اور احترام واخلاص رہا (ص ۳۱۹) کیا جہانگیر کو اسکی خبر نہیں رہی؟ پھر حضرت مجدد الف ثانیؒ کے بہت ہی محبوب مرید شیخ فرید مرتضیٰ خاں بخاری تھے، وہ جہانگیر کے بھی بہت ہی مقرب درباری امیر تھے، اس کی تخت نشینی میں ان کا بڑا کارنامہ ہے، جب وہ شاہی تخت پر بیٹھا تو اس نے ان کو صاحب السیف والقلم کا خطاب اور پنج ہزاری منصب بھی دیا، (مآثر الامرا جلد دوم ص ۶۴۰-۶۳۳) حضرت مجددؒ کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ فرید کو بادشاہ کا قرب حاصل تھا، ان کو خلوت وجلوت میں شریعت محمدی کی ترویج کا موقع حاصل تھا، حضرت مجدد کو ان سے امید تھی کہ وہ ترویج شریعت کی سعادت حاصل کر کے سب سعادت مندوں سے بازی لے جائیں گے (مکتوبات ربانی جلد اول نمبر ۵۱، ص ۷۰) خود مولانا بھی تحریر فرماتے ہیں کہ نواب سید فرید نے حکومت کا رخ بدلنے میں بنیادی اور مرکزی کردار ادا کیا، (ص ۳۱۶) یہ امر واقعہ ہے کہ حضرت مجددؒ ہی کے اثر سے شیخ فرید نے جہانگیر پر دباؤ ڈالا

کہ وہ اسلامی شعائر کے ساتھ حکومت کرے، جہانگیر نے اس کے لئے وعدہ بھی کر لیا، اور شیخ فرید کو چار علماء کو مقرر کر کے اس کے دربار سے وابستہ کرنے کی ہدایت بھی دی، تاکہ وہ مسائل شرعیہ بیان کرتے رہیں، شیخ فرید نے خوشی کے عالم میں اس کی اطلاع حضرت مجدد کو دی، جس کے جواب میں انھوں نے شیخ فرید کو تحریر فرمایا کہ اس مقصد کے لئے ایک عالم ہی کا انتخاب کیا جائے تو بہتر ہوگا، تاکہ چار علماء کے اختلاف سے مقصد فوت نہ ہو جائے، اس کی تفصیل خود مولانا ابوالحسن علی ندوی نے زیر نظر کتاب ص ۱۴۰-۱۳۰ پر لکھی ہے، اس سے ظاہر ہے کہ حضرت مجدد دربار پر اثر انداز ہو رہے تھے،

وہ خود جہانگیر کے دربار کے ایک با اثر امیر صدر جہاں (م ۱۰۲۷ھ) کو لکھتے ہیں کہ احکام شرعیہ کے جاری ہونے اور مذہب مصطفوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے دشمنوں کی خواری کی باتیں سن کر ماتم زدہ مسلمانوں کے دل کو خوشی ہوئی، اس باب میں اللہ تعالیٰ کی مدد اور اسکا احسان ہے، (مکتوبات امام ربانی نمبر ۱۹۴) جہانگیر کے دربار کا رکن رکین خان اعظم (م ۱۰۳۳ھ) تھا، اس کو بھی حضرت مجددؒ سے بڑی محبت و عقیدت تھی، اور خود حضرت مجدد اس کے معترف تھے، اس لئے اس کو اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ ہاری ہوئی بازی میں اس کے سوا کوئی اور مرد میدان نہیں (مکتوبات ربانی جلد اول نمبر ۶۵) اسی طرح عبدالرحیم خاں خانان (م ۱۰۳۶ھ) اور اس کا لڑکا داراب خان (م ۱۰۳۴ھ) اور دوسرے امراء بھی ان کے معتقد تھے، کیا جہانگیر اپنے ان امراء کے روحانی پیشوا سے بے خبر رہا؟ جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد شیخ فرید بخاری (م ۱۰۲۵ھ) گیارہ سال تک زندہ رہے، کیا انھوں نے حضرت مجدد کی عظمت اور بزرگی سے جہانگیر کو ناواقف رکھا؟ یہ کیسے یقین کیا جا سکتا ہے، پھر خود مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اس کی طرف توجہ دلائی ہوگی کہ حضرت مجدد کے جس مکتوب پر جہانگیر نے ان کو مورد الزام قرار دے کر اسیر کیا، وہ ۱۰۱۲ھ میں لکھا گیا، اور حضرت مجدد کی گرفتاری ۱۰۲۹ھ میں عمل میں آئی (ص ۱۶۱)

جہانگیر گرفتاری کا ذکر اپنے چودھویں سال جلوس ..... میں کرتا ہے، اس کی تخت نشینی ۱۰۱۴ھ میں ہوئی، جس سے ظاہر ہے کہ حضرت مجددؒ نے متنازع فیہ مکتوب اس کی تخت نشینی سے دو سال پہلے لکھا، وہ اپنی حکومت کے چودہ سال تک اس مکتوب سے گویا بے خبر رہا، یہ تسلیم کرنے میں تامل ہے، پھر یکایک چودہ سال کے بعد اس کی رگِ حمیت کیوں پھڑک اٹھی، اس کا مورخانہ تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے، اگر شیخ فرید بخاری زندہ ہوتے تو شاید حضرت مجددؒ کی اسیری عمل میں نہ آتی، وہ اس اسیری سے تین سال پہلے وفات پا چکے تھے، مگر خان اعظم، صدر جہان، عبدالرحیم خان خانان اور داراب خان وغیرہ تو اس وقت زندہ تھے، وہ آخر خاموش کیوں رہے؟ ان کی رگ حمیت کیوں نہیں پھڑکی؟ وہ اپنے شاہی آقا کے سامنے اپنے روحانی آقا کے اخلاص، للّٰہیت، بے لوثی، بے غرضی اور علوئے مقام کو تو ظاہر کر سکتے تھے، یا ان کا ضمیر ان کے ذاتی مفاد اور وجاہت پرستی کی خاطر اتنا مردہ ہو گیا تھا کہ انھوں نے اپنے مذہبی پیشوا کے لیے کچھ کرنا پسند نہیں کیا، یا وہ دربار کے شیعی امراء کے اثرات سے اتنے دب کر رہ گئے تھے کہ شیعی امراء نے حضرت مجددؒ کے خلاف جہانگیر کو استعمال کیا، اور سنی امراء کے لیے دم بخود رہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا، حضرت مجددؒ کے خلاف شیعی امراء کا ہونا تو سمجھ میں آتا ہے کیونکہ دربار میں جو شیعی اثرات بڑھ رہے تھے، ان کو بھی زائل کرنا چاہتے تھے، حضرت مجددؒ نے ردِ شیعیت میں جو کچھ لکھا یا کیا، اس کے متعلق ..... مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنی اس کتاب میں کچھ لکھنا پسند نہیں فرمایا، شاید لکھنؤ کے سنی شیعہ کے جھگڑوں کی فضا میں احتراز کرنا ہی مناسب سمجھا ہو، مگر حضرت مجددؒ کی اسیری کے سلسلہ میں شیعیت ضرور پس پردہ رہی، شاہی حرم میں نور جہاں کے داخل ہونے کے بعد دربار پر اس کے خاندان کے افراد چھا گئے، شیعی اثرات کا بڑھنا لازمی تھا، نور اللہ شوستری کا قتل شاہی حرم میں نور جہان کے آنے سے پہلے ہوا تھا، جس سے شیعے بہت بددل اور آزردہ تھے، عام خیال تو یہی ہے کہ جہانگیر نے ان کو قتل کرایا، گو اس کی تزک میں اس کا ذکر مطلق نہیں، اقبال نامۂ جہانگیری اور مآثر جہانگیری سے بھی اس کی

شہادت نہیں ملتی کہ جہانگیر نے ان کو قتل کرایا، یہ شیعوں کی روایت ہے، اگر جہانگیر نے واقعی ان کو قتل کرا دیا تو ممکن ہے کہ نورجہاں اور اس کے خاندان کے دباؤ سے جہانگیر نے اپنے شیعی امرا کی خاطر حضرت مجددؒ کو گوالیار کے قلعہ میں نظر بند کر دیا، گو بعد میں ان کے علوے مقام کا معترف ہو گیا،

اس کے علاوہ اس کی طرف بھی ذہن جاتا ہے کہ جہانگیر نے جب خود تزک قلمبند کرنا چھوڑ دیا، تو سترہویں جلوس سے انیسویں جلوس تک کے کچھ حصے اس کے ندیم خاص محمد شریف نے لکھا، جس کو اس نے معتمد خان کا خطاب دیا تھا، وہ ایرانی یعنی شیعہ تھا، (مآثر الامرا جلد سوم ص ۴۳۱) جہانگیر کے ایک اور درباری مرزا محمد ہادی نے تزک کا تکملہ لکھا، یہ بھی شیعہ ہی تھا، اس کے شروع میں دیباچہ بھی اسی کا تحریر کیا ہوا ہے، وہ دیباچہ میں لکھتا ہے کہ اس نے تزک جہانگیری کو اپنے قلم سے نقل کیا، اور اس کا تکملہ بھی کیا ہے، یہ قرین قیاس ہے، کہ اس نے یا معتمد خاں نے حضرت مجددؒ سے متعلق ایک نا روا تحریر لکھ کر ان کی شیعیت دشمنی کا انتقام لیا ہو، یہ بحث ایسی ہے، جس کا ناقدانہ تجزیہ اچھی طرح کرنا ضروری ہے، جہانگیر، اکبر اور شاہجہان سے زیادہ علم شناس تھا، اس کی نظر ادب، شاعری، لغت اور مذہبی علوم پر بھی رہی، وہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کا قدردان تھا، ان کی کتاب اخبار الاخیار کی خوبیوں کا بھی قائل رہا، اس نے اگر مکتوبات ربانی کے متعلق واقعی وہی لکھا ہے، جو پچھلے صفحہ میں درج کیا گیا تو یہ عقدہ لاینحل معلوم ہوتا ہے، خود مولانا ابوالحسن علی ندوی تحریر فرماتے ہیں "یقیناً وہ یعنی جہانگیر ایک سلیم الطبع، ذہین اور ہوشمند فرمانروائے سلطنت کی حیثیت سے جس کو امرا و علما کے ساتھ، دنیا داروں اور دینداروں کی ایک بڑی تعداد کے حالات کا اپنے والد اکبر کے دور سے اس وقت تک مطالعہ کرنے کا موقع ملا تھا، اور اس سے اس میں مردم شناسی کی وہ صلاحیت پیدا ہو گئی تھی، جو ان لوگوں کو حاصل نہیں ہو سکتی جن کو کھرے اور کھوٹے کے پرکھنے کا اتنا طویل موقع نہیں ملتا (ص ۳۰۹) پھر یہ کیسے یقین کیا جائے کہ حضرت مجددؒ کا رتبہ ناشناس ہو کر اس نے ان کے متعلق نا روا اور تحقیر آمیز

تحریر لکھ دی،

تزک میں حضرت مجددؒ پر جو یہ الزام ہے کہ انھوں نے خلفاء کے مقام سے گذر کر عالی تر مقام پر پہونچنے کا دعویٰ کیا ہے، اس پر کافی بحث ہو چکی ہے، اگر مولانا ابوالحسن علی ندوی اپنے امعانِ نظر سے اس الزام کو کس طرح دیکھتے ہیں، اس کو جاننے کی ایک فطری خواہش پیدا ہوتی ہے، داراشکوہ جہانگیر کا پوتا تھا، اس نے حضرت مجددؒ صاحب کے سلسلہ میں لکھا ہے،

از متاخرین مشائخ و صاحب ریاضت و مجاہدات و خوارق و تصانیف اند، در اواخر حال بعضے بر شیخ تہمت کردند کہ شیخ می گوید مرتبۂ من زیادہ از خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اما این محض بہتان و افترای مخالفان است بر شیخ چرا کہ این فقیر خود شنیدہ از سیادت و ثقاہت پناہ فضائل و کمالات دستگاہ حقائق و معارف آگاہ افضل فضلائے عصر علامی فہامی استاذی حضرت میرک شیخ بن شیخ فصیح الدین کہ می فرمودند کہ وقتے مارا عبور بسرہند واقع شد و کیف ما اتفق ملاقات شیخ احمد روی داد در اثنائے ملاقات بخاطر گذشت کہ اگر شیخ را کرامتی است باید کہ مردم آنچہ از ایشان بیان می کنند خاطر نشان من سازند۔ . . . . . چون ساعتی پیش شیخ نشستم جزو یکہ از زیر مسند خود من دادند کہ مطالعہ نمایند، چون از اتمام بدیدم ہمین گفتند ازین چیزی ظاہر می شود، گفتم ازین خود ہیچ ظاہر نمی شود و آنچہ در اینجا ثبت درست است، گفتند پس بدانید کہ آنچہ از ما واقع شدہ عین است و باقی افتراست "

(سفینۃ الاولیاء ص ۴۰۰)

یہ تحریر بہت اہم ہے، اس سے ظاہر ہے کہ حضرت مجددؒ کے خلاف افتراپردازی کی ایک اہم چلائی گئی، جس میں یقیناً غیر سنی ہی شریک ہونگے، ان کی اسیری کا روشن پہلو یہ ہے کہ جہانگیر، نورجہان اور اس کے خاندان کے متعلقین کے ساتھ رہنے کے باوجود حضرت مجددؒ کی رہائی کے بعد ان کی تعلیمات سے متاثر ہوا،

اور اسکو احساس ہوا، جیسا کہ مولانا نے بھی تحریر فرمایا ہے کہ حضرت مجددؒ ان لوگوں سے مختلف ہیں، جو ابھی تک دربار کی زینت یا بوریائے فقر کے مسند نشین تھے، (ص ۳۱۸)

زیر نظر کتاب کے باب پنجم میں حضرت مجددؒ کے دائرۂ تجدید کا مرکزی نقطہ کے عنوان سے جو کچھ لکھا گیا ہے اور حضرت مجددؒ نے نبوت محمدیؐ کی ابدیت کو جس طرح ثابت کیا ہے اس کو اس کتاب میں بہت ہی دل نواز انداز میں پیش کیا گیا ہے یہ بہت ہی مفید حصہ ہے، جہاں حضرت مجددؒ کی تحریروں کی روشنی میں یہ دکھایا گیا ہے کہ عقل کہاں عاجز ہو کر رہ جاتی ہے، کچھ دن ہوئے کہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے ایک سمینار میں حیدر آباد کے ایک مقالہ نگار نے یہ کہہ کر اپنے سامعین کو چونکا دیا کہ اگر وحی بھی عقل کے مطابق نہ ہو، تو یہ بھی قابلِ قبول نہیں، ایسے ذہن رکھنے والے حضرات زیر نظر کتاب کے اس حصہ کا مطالعہ کریں گے تو ان کا تاریک ذہن یقیناً روشن ہو جائے گا، ان پر اچھی طرح واضح ہو جائے گا، کہ انبیاءؑ کی اطلاعات کو اپنی عقل کا پابند بنانا طریق نبوت کا انکار ہے جس کے بعد الحاد کی سرحد شروع ہو جاتی ہے،

حضرت مجددؒ نے کتاب و سنت کی پابندی اسوۂ رسول کی پیروی اور شمائل و اخلاقِ نبوی کے تتبع اور اسی کے ساتھ طریقت کو شریعت کی خادم قرار دینے کی جو زلزلہ انگیز تحریک چلا کر اس دور کے ظلمات کے امنڈتے ہوئے دریا کا جس طرح رخ موڑ دیا اس کی تصویر کشی اس کتاب میں بہت عمدہ طریقے پر کی گئی ہے،

اس کتاب میں وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی بڑی فاضلانہ بحث ہے، یہ دونوں مسئلے ایسے ہیں کہ ان کا سمجھنا سب لوگوں کے بس کی بات نہیں، مگر ان کو اس کتاب میں ایسا منقح کر دیا گیا ہے کہ ان کو سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہوگی، موجودہ دور کے کچھ ایسے بھی لوگ ہیں، جو یہ سمجھتے ہیں کہ وحدت الوجود کے حامی رام و رحیم، کفر و ایمان، حق و باطل میں تفریق نہیں کرتے، یہ غلط فہمی اس کتاب کے

مطالعہ سے دور ہو جائیگی، یہ عام طور سے یہ سمجھا جاتا رہا کہ حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ وحدت الوجود کے بہت بڑے حامی تھے، مگر مولانا ابو الحسن علی ندوی نے شاید پہلی دفعہ اس کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ان کے یہاں وحدت الوجود کے متوازی وحدت الشہود کا بھی ذکر ملتا ہے (ص ۲۷۳) اسی کے ساتھ یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ حافظ ابن تیمیہؒ بھی وحدت الشہود کے کوچہ سے آشنا ہے (ص ۲۷۳) مگر وحدت الشہود کو جس مفصل اور واضح طریقہ سے حضرت مجددؒ نے پیش کیا، پہلے کسی اور نے نہیں کیا، اب محی الدین ابن العربیؒ کا وحدت الوجود اور حضرت مجددؒ کا وحدت الشہود دو متوازی طرز فکر سمجھا جانے لگا ہے، حضرت مجددؒ کو محی الدین ابن العربی کے وحدت الوجود کے بنیادی تخیل سے اختلاف نہیں، وہ ابن العربی کو مقبولینِ حق میں شمار کرتے ہیں، لیکن وہ ان کے ان غالی متبعین پر ضرب کاری لگاتے ہیں جو وحدت الوجود کی من مانی تعبیر کر کے اپنے بے باکانہ اقوال سے اباحت، فوضویت اور اخلاقی انارکی کی ترویج کی طرف مائل ہو جاتے ہیں،

اس کتاب میں "عقیدۂ وحدت الوجود ہندوستان میں" کے عنوان سے جو کچھ لکھا گیا ہے اس کو پڑھ کر ذہن میں بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں، جن صوفیائے کرام نے توحید وجودی کا سبق ہندوستان ہی سے لیا، اس کی کیا نوعیت تھی، کیا وہ اسلامی توحید وجودی سے ہم آہنگ تھا، یا دونوں متضاد چیزیں تھیں، یہ تسلیم کہ ہندوستان میں مسلمان آکر آباد ہوئے تو مقامی خیالات سے ان کا متاثر ہونا ناگزیر تھا، انھوں نے جو تاثرات قبول کیے وہ اسلامی طرز فکر سے قریب تر تھے یا یہ بدعات تھیں، حضرت مجدد صاحب تو بدعاتِ حسنہ کے بھی قائل نہیں (ص ۲۵۳) اگر توحید وجودی کا سبق ہندوستان سے واقعی لیا گیا تو کیا اس سے فکری انتشار نہیں پھیلا؟ اس کتاب میں یہ بحث تفصیل کے ساتھ آجاتی تو مفید ہوتی، شیخ محمد غوث گوالیاریؒ اور دارا شکوہ خود ہندوستان کے تخیل وحدت الوجود کو متاثر ہوئے مگر وہ مقبول نہ ہو سکے، انکے خیالات کتابوں تک محدود رہ گئے، جو مورخین کے لیے ایک اچھا موضوع ہے،

مگر راسخ بزرگانِ دین کے لئے نہیں، مولانا ابوالحسن علی ندوی تحریر فرماتے ہیں، یہاں آکر اس فلسفہ کے مزاج نے مقامی مزاج سے ہم آہنگ و ہم آغوش ہو کر ایک نیا جوش اور ایک نیا مکتبِ خیال پیدا کر لیا، یہاں کے مشایخ میں ایک بڑی تعداد اس مشرب کی حامی و حامل اور مبلغ و داعی نظر آتی ہے، (ص ۱۰۲) اسی کے بعد شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ، شیخ عبدالرزاق جھنجھانویؒ، شیخ محمد برہانپوریؒ اور شیخ محب اللہ الہ آبادیؒ کے نام لئے گئے ہیں، یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو نیا مکتبِ خیال پیدا ہوا وہ کیا ہندوستان کے فلسفۂ وحدت الوجود سے متاثر ہوا، اور کیا اس نئے مکتبِ خیال اور ابن عربی کے وحدت الوجود میں فرق تھا؟ مقامی مزاج سے ہم آہنگ و ہم آغوش ہو کر اس نئے مکتبِ خیال سے کفر و اسلام، امر و نہی اور ثواب و عذاب کی تفریق باقی رہی کہ نہیں، جن بزرگوں کے نام اوپر درج کئے گئے ہیں، وہ تو اس تفریق کے قائل تھے، البتہ شیخ محب اللہ الہ آبادیؒ کا رسالہ تسویہ متنازع فیہ ہو گیا تھا، مگر ان پر شیخ ابن عربی ہی چھائے رہے، انھوں نے فصوص الحکم کی شرحیں فارسی اور عربی دونوں میں لکھیں، اور سمعاً و طاعۃً شریعت کو قبول کرنے کی دعوت دی، اس کے بعد یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ وجودیا اور دوسرے صوفیائے کرام نے مقامی مزاج سے ہم آہنگ و ہم آغوش ہو کر وحدت الوجود میں کیا نئی چیز قبول کی جس سے ایک نیا مکتب خیال پیدا ہوا،

حضرت مجددؒ کے بعد توحید وجودی کے بارے میں مشائخ و علماء کا جو مصالحانہ رویہ رہا، اس سلسلہ میں شاہ عبدالرحیمؒ، شاہ ولی اللہؒ، ان کے چچا شاہ ابوالرضاؒ، شاہ عبدالعزیز دہلویؒ، اور مرزا مظہر جانجاناںؒ کی رائیں بھی مختصر طریقہ پر لکھ دی جاتیں تو یہ بحث مکمل ہو جاتی، مولانا نے صرف اتنا لکھنے پر اکتفا کیا ہے کہ بعض بلند پایہ

علماء اور محققین نے یہاں تک لکھ دیا کہ یہ اختلاف (یعنی وحدت الوجود اور وحدت الشہود کا اختلاف) محض نزاعِ لفظی تھا، بعض حضرات نے یہاں تک لکھا کہ، مجدد صاحبؒ سے اس بارہ میں تسامح ہوا، اور شیخ اکبر کی تمام تصنیفات ان کی نظر سے نہیں گذریں، (ص ۲۸۹) جہاں تک اس عاجز راقم کا مطالعہ ہے شاہ ولی اللہؒ ہی نے یہ تحریر فرمایا کہ شیخ محی الدین ابن عربی کا وحدت الوجود اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کا وحدت الشہود ایک ہی شے کے دو نام ہیں، وجود و شہود محض نزاع لفظی ہے، ان میں مطابقت ہے، مخالفت نہیں، (مکتوب مدنی شایع کردہ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور) یہ بہت ہی اہم رائے ہے، امید کہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کو بھی اس رائے سے اتفاق ہوگا، اگر وہ اپنی شگفتہ تحریروں کے ذریعہ سے اس کی وضاحت فرما دیتے تو شاید وحدت الوجود . . . . . اور وحدت الشہود کا جھگڑا ختم ہو جاتا، اسی طرح جن حضرات کا یہ خیال ہے کہ مجدد صاحبؒ سے شیخ اکبر کے خیالات کے سمجھنے میں تسامح ہوا تو یہ تسامح واقعی ہوا یا نہیں، اگر اس کی بھی توضیح ہو جاتی تو ایک مفید کام ہوتا،

باب ہفتم کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت مجددؒ اپنی رہائی کے بعد لشکر شاہی کے ساتھ ساڑھے تین سال تک رہے، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ مدت بھی حضرت مجددؒ کی نظر بندی کی تھی، مگر شاہی لشکر سے حضرت مجددؒ نے جو خطوط لکھے ان سے وہ جہانگیر کے شاکی نظر نہیں آتے، بلکہ اس کی صحبتوں میں جو دینی مذاکرے ہوتے رہے، اس سے وہ مطمئن دکھائی دیتے ہیں، بلکہ ان کے ایسے مکتوبات میں انشراحی کیفیت محسوس ہوتی ہے، خود مولانا ابوالحسن علی ندوی کا خیال ہے کہ جہانگیر کی تزک کی تحریروں میں حضرت مجددؒ کی صحبت و جذبات کا اثر صاف جھلکتا ہے (ص ۳۱۶) اور اس بادشاہ اسلام نے اسلام سے دلچسپی لی (ص ۳۱۹) وہ یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ شاہ جہاں کے عہدِ سلطنت پر حضرت مجدد الف ثانیؒ کے اثرات سایہ افگن ہوئے، (ص ۱۹) انھوں نے

مختلف اقتباسات سے یہ بھی دکھایا ہے کہ شاہجہاں شریعت کا احترام کرنے والا بادشاہ تھا، اور فرائض شرعی کا پابند بھی تھا (ص ۳۲۰) لیکن وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس احترامِ شریعت اور قدرے دینی حمیت کے ساتھ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شاہجہان اپنے متشرع، صاحب علم اور صاحب صلاحیت فرزند اورنگ زیب کے مقابلہ میں اپنے صلح کل اور آزاد مشرب بڑے بیٹے دارا شکوہ کو ترجیح دیتا تھا، اور اسی کو تخت و تاج کا وارث اور اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ دکھ اور درد کے ساتھ لکھتے ہیں کہ یہی شخصی وموروثی سلطنتوں اور دین وسیاست کی تفریق کے اصول پر کاربند فرمانروایانِ سلطنت کی وہ خصوصیت ہے، جہاں ان کی ذاتی دینداری امور سلطنت پر اثر انداز اور کسی غلط یا مضر جانشین کے انتخاب میں مانع نہیں بنتی، (ص ۲۲ - ۳۲۱)

اسی باب میں مولانا داراشکوہ کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ عہد عالمگیری میں جو تاریخیں مرتب کی گئی ہیں، محض ان کے اعتماد پر ہم داراشکوہ کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ نہ اس کے قطعی طور پر بے دین اور بدعقیدہ ہونے کا حکم لگا سکتے ہیں (ص ۳۲۲) مگر اسی کے بعد وہ دائرۂ معارف اسلامیہ کے مقالہ نگار کا جب یہ حوالہ دیتے ہیں کہ وہ ہندو فلسفہ اور صنمیات سے متاثر تھا، جس کی وجہ سے وہ متعدد ایسے ملحدانہ خیالات کی طرف مائل ہوگیا، جن کے واضح مماثل ہندو فلسفہ میں پائے جاتے ہیں، اور جن کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں (ص ۳۲۲) تو پھر اسلامی نقطۂ نظر سے داراشکوہ کے بے دین اور بدعقیدہ ہونے کا تو حکم لگ ہی جاتا ہے، اس کے علاوہ داراشکوہ نے اپنشد کے فارسی ترجمہ میں جو دیباچہ لکھا ہے یا جوگ بشست کے فارسی ترجمہ کرانے کی جو وجہ بتائی ہے، اس سے خود وہ قطعی طور پر بے دین اور بدعقیدہ ظاہر ہوجاتا ہے، پھر عالمگیری عہد کی تاریخوں کو اعتماد میں لینے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔

اسی باب میں اورنگ زیب کی دینی حمیت کا ذکر ہے، جو حضرت مجددؒ کے خاندان سے

عقیدت رکھتا تھا، اور ان کی دعوت سے شروع سے متاثر تھا، اس نے حضرت خواجہ محمد معصومؒ سے بیعت وارادت کا تعلق بھی قائم کر لیا تھا، (ص ۳۲۲) حضرت مجددؒ کی اصلاحی وتجدیدی تحریک کا اثر تھا کہ وہ سلطنت کو ہادمِ اسلام کے بجائے خادم اسلام بنانے کی کوشش میں لگا رہا (ص ۳۲۰)

حضرت مجددؒ کی مخالفت اور تضلیل کی تحریک کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کی تفصیل پڑھ کر عام قارئین کو یہ تکلیف ہوتی ہے کہ آخر ان کے خلاف مخالفت اور تضلیل کی تحریک کیوں چلائی گئی، مولانا ابوالحسن علی ندوی اس سلسلہ میں رقمطراز ہیں کہ ایسا معاملہ اکثر ان نادرۂ روزگار شخصیتوں کے ساتھ پیش آیا ہے، جو کسی علم وفن کے مجتہد، کسی سلسلہ وطریق کے بانی اور اپنے زمانہ کی عام علمی ذہنی وباطنی سطح سے بلند ہوتی ہیں، اور جن کو اللہ تعالیٰ علوم وکمالات وہبی سے نوازتا ہے، (ص ۳۳۶) مگر اس سے ان علماء کی براءت نہیں ہوتی، جو خواہ مخواہ مخالفت پر کمربستہ ہوجاتے ہیں، اس سے ان انتشار پسندوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے، جو اسلام کی آڑ میں ایسی تحریکیں چلاتے ہیں، جن میں صرف انارکی، انتشار ضلالت، گمرہی اور پستی، بددینی ہوتی ہے، ان کی مخالفت ہوتی ہے تو وہ اپنے گمراہ پیرودں اور سادہ لوح مقلدوں کو یہ کہہ کر تسلی دیتے ہیں کہ اسلام کی کون ایسی مفید تحریک ہے جس کی مخالفت نہیں کی گئی،

حضرت مجددؒ کی مخالفت کچھ دنوں شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ نے بھی کی ہے، مگر اس کا روشن پہلو یہ ہے کہ ان کی غلط فہمی جب دور ہوگئی تو ان کی مخالفت عقیدت میں تبدیل ہوگئی، حضرت مجددؒ کے متعلق ان کی ایک تحریر اخبار الاخیار کے آخر میں درج ہے، جس میں انھوں نے حضرت مجددؒ سے اپنی محبت وعقیدت اور اسی کے ساتھ ان کی جلالت وعظمت کا پورا اعتراف کیا ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ تحریر الحاقی ہے، شاید اسی لئے مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اس کا حوالہ اپنی کتاب میں نہیں دیا ہے، اس دور میں کچھ ایسے اہل قلم بھی پیدا ہوگئے ہیں، جو

خواہ مخواہ ہماری اہم علمی وراثت کو الحاقی قرار دے کر اس میں شک و شبہہ پیدا کر دیتے ہیں
ہندوستان کی قدیم تاریخ لکھنے کے سلسلہ میں کچھ مورخین من گھڑت فرضی اور جعلی مواد کہیں نہ کہیں
سے دستیاب کر کے اپنی تاریخ مرتب کرنے میں مشغول ہیں، مگر ہماری وراثت میں جو مفید چیزیں ہم کو
ملی ہیں، ان سے فائدہ اٹھانے کے بجائے کچھ اہل قلم ان کو الحاقی اور فرضی قرار دینے میں مشغول ہیں،
شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کا جو خط حضرت خواجہ حسام الدین دہلوی کے نام سے ہے اس کو مولانا
ابوالحسن علی ندوی نے نقل کیا ہے، (ص ۳۳۹) اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں،" ان کی (یعنی
شیخ عبدالحق کی)، حضرت مجددؒ کے بارے میں غلط فہمی رفع ہوئی، اور آپ کا علوے مقام ان پر
منکشف ہوا تو انھوں نے اس کی تلافی کرنے میں قطعاً تقصیر و تاخیر سے کام نہیں لیا اور بڑے
بلند الفاظ میں حضرت مجددؒ کے ساتھ خلوص و محبت کا اظہار کیا جو ان کے جیسے عالم ربانی
ہی کے شایان شان ہے، (ص ۳۳۹) اخبار الاخیار کے آخر میں جو تحریر ہے اس میں بلند الفاظ
کے ساتھ اسی خلوص و محبت کا اظہار ہے، جو ان کے جیسے عالم ربانی ہی کے شایانِ شان
ہے، اور جوابات شیخ عبدالحق نے حضرت خواجہ حسام الدین احمد دہلوی کو لکھی ہے، وہی اخبار الاخیار
کے آخری ضمیمہ میں ہے صرف اجمال اور تفصیل کا فرق ہے، ظاہر ہے کہ ایک مکتوب میں وہ ساری
باتیں نہیں لکھیں جا سکتی تھیں جو اخبار الاخیار کی تحریر میں ہیں،

اسی باب میں اورنگ زیب عالمگیر کا ایک مراسلہ یا فرمان نقل کیا گیا ہے، جو ایک
غیر معروف اور غیر مستند مصنف کی کتاب کاسر المخالفین سے لیا گیا ہے، اس میں اورنگ زیب
کی طرف سے یہ ہدایت ہے کہ مکتوبات شیخ احمد سرہندی کے بعض مقامات ظاہراً عقائد اہل
سنت کے مخالف ہیں، شیخ مذکور کے معتقد جو شہر اورنگ آباد میں سکونت رکھتے ہیں، ان کی
اشاعت کرتے ہیں، ان کا درس دیتے ہیں، ان عقائد باطلہ کی حقیت پر اعتقاد رکھتے ہیں،

حکم ہے کہ اس کے درس و تدریس کو روک دیا جائے، اور جس کے متعلق معلوم ہو کہ وہ ان عقائد
باطلہ پر اعتقاد رکھتا ہے، اس کو سزائے شرعی دی جائے، (ص ۳۵۱)

اورنگ زیب کو حضرت مجددؒ اور ان کے خاندان سے جو روحانی اور قلبی تعلق تھا اسکی بنا پر
یہ گمان بھی نہیں کیا جا سکتا ہے، کہ وہ اس نتیجہ پر پہونچا ہو کہ مکتوبات شیخ احمد سرہندیؒ کے بعض مقامات
ظاہراً عقائد اہل سنت کے مخالف ہیں، اگر یہ مراسلہ یا فرمان اورنگ زیب کے ضخیم مجموعۂ فرامین
میں مل جائے تو اسکو مستند سمجھنے میں کسی کو عذر نہ ہوگا، دارالمصنفین میں فیاض القوانین کا ایک
ضخیم عمدہ نسخہ موجود ہے، راقم کی نظر اس پر جہاں تک گئی، اس میں یہ مراسلہ یا فرمان نہیں
گذرا، اس سے یہ یقین کامل ہے کہ یہ ایک غیر مستند، جعلی اور فرضی تحریر ہے، جس کو حضرت
مجددؒ کے مخالفین نے وضع کیا ہے، اور اس کو ایک یہودی مصنف نے زیادہ اہمیت دی ہے،
جو اس بات کا مزید ثبوت ہے، کہ یہ افترا محض انتشار پسندی کی خاطر کیا گیا ہے،

حضرت مجددؒ کے خلفاے کبار اور ان کے منتسبین کے ذریعہ سے ان کے تجدیدی کام کی
جو توسیع اور تکمیل ہوئی، اس کی تفصیل کتاب کے باب ہشتم میں ہے، اور آخر میں حضرت مجددؒ کی تمام
تصانیف کا ذکر ہے، آخر میں بے اختیار ہو کر یہ لکھنے کو جی چاہتا ہے کہ یہ اہم اور مفید کتاب ایسی ہے
کہ اس کتاب کے مطالعہ سے مسلمان قارئین کے ذہن پر نہ صرف ہندوستان کی ایک عظیم مذہبی
شخصیت کی عظمت، جلالت اور اہمیت کا اندازہ ہوگا، بلکہ خود ان کی دینی حمیت میں جلا
پیدا ہوگی، اس کتاب کا ترجمہ انگریزی میں ضرور ہونا چاہئے، البتہ انگریزی ترجمے میں بعض ثانوی
ماخذوں کو نکال کر معاصر ماخذوں کے حوالے زیادہ سے زیادہ دیے جائیں، جو آسانی سے حاصل
کیے جا سکتے ہیں،

"ص - ع"

مطبوعات جدیدہ

اجتہاد کا تاریخی پسِ منظر :- مرتبہ، مولانا محمد تقی امینی متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر صفحات ۲۱۶ مجلد مع گرد پوش قیمت ۱۸ روپے غیر مجلد ۱۵ روپیہ، پتہ ادارہ علم و عرفان، امینی منزل، دودھ پور روڈ، علی گڑھ،

اجتہاد مسلمانوں کی دقیقہ سنجی، نکتہ رسی، بصیرت، ژرف نگاہی، تفریع، استنباط، استدلال اور غور و فکر کا حیرت انگیز ثبوت ہے، اس کتاب میں اجتہاد کا تاریخی پس منظر اور تدریجی ارتقا بیان کرکے اس کے اہم اصول و ضوابط اور نامور مجتہدین کے طریقۂ استنباط کی خصوصیات تحریر کی گئی ہیں، اور اجتہاد کے سلسلہ میں مسلمانوں کا تاریخی کردار اور کارنامہ دکھایا گیا ہے، پہلے اجتہاد کی تعریف، اہمیت، اس کے شرعی دلائل، اس کے لئے ضروری اوصاف اور اس کی صورتیں بیان کی ہیں، اس ضمن میں شعور نبوت و شعور اجتہاد کی دقیق و لطیف بحث اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اجتہاد کے بعض نمونے بھی دیئے ہیں، پھر آپ کے بعد کے زمانہ کے ترقی پذیر معاشرہ میں اجتہاد کی وسعت و ترقی دکھانے کے لئے اسکے تین دور کا ذکر ہے، پہلا اور دوسرا دور صحابہ و تابعین کے اجتہادی کارناموں پر مشتمل ہے، اور تیسرا دور ائمہ مجتہدین کے اجتہاد پر بحث کے لیے خاص ہے، یہی اس کتاب کا زیادہ اہم حصہ ہے، اس میں فقہائے اربعہ اور بعض دوسرے ممتاز فقہا کے استنباط کے طریقے اور مثالیں درج ہیں، مصنف نے مختلف قوموں کے اختلاط سے اسلامی معاشرہ میں پیدا ہونے والی بحرانی کیفیت اور کشمکش کا مقابلہ کرنے کے لئے فقہاء کے اجتہاد کے زرین اصول وضع کرنے کا ذکر کیا ہے، اور دکھایا ہے کہ اجتہاد کی تین قسموں، توضیحی، استنباطی اور استصلاحی میں غیر معمولی وسعت دے کر انھوں نے ہر دور اور ہر معاشرہ میں نمو پذیر زندگی کے لئے رہنمائی آسان کردی ہے، ان بحثوں میں اجتہاد کی مختلف قسموں اور ضوابط کے علاوہ اس کی متعدد اصطلاحات کی تعریف و توضیح مثالوں کے ذریعہ کی ہے، اسطرح اس کتاب سے اجتہاد کا تاریخی پسِ منظر بھی سامنے آجاتا ہے، اور ائمہ کے مجتہدین کی غیر معمولی تحقیق، تدقیق، کاوش اور دقت نظر وغیرہ کا مرقع بھی ہے، مصنف کو جس طرح اجتہاد کی نزاکتوں کا احساس ہے، اسیطرح موجودہ دور کی پیچیدگیوں کا بھی اندازہ ہے، اس موضوع پر ان کی متعدد مفید کتابیں شایع ہو چکی ہیں، ان سے دورِ حاضر میں اجتہاد کی راہ ہموار ہوتی ہے یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی اور اہل علم کے مطالعہ کے لائق ہے،

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمرے اور سفر حجۃ الوداع :- مرتبہ جناب مولوی معین الدین احمد فاروقی، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت معمولی صفحات ۴۸، قیمت پانچ روپیہ، پتہ از مولف بیرون یاقوت پورہ محلہ اٹلی بن مکان نمبر ۱-۳-۲۰۵، حیدرآباد دکن۔

یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمروں کا ذکر ہے، اور دوسرے میں حجۃ الوداع کی تفصیل درج ہے، پہلے حصہ میں عمرۃ القضا اور عمرۃ الجعرانہ کے علاوہ صلح حدیبیہ کا مفصل تذکرہ ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سفر بھی عمرہ ہی کے ارادہ سے کیا تھا، لیکن کفار کی مزاحمت سے آپ عمرہ نہ کرسکے، تاہم یہ تاریخ اسلام کا اہم بالشان واقعہ ہے، اور یہی صلح فتح مبین کا پیش خیمہ بنی اس لئے لایق مصنف نے آنحضرتؐ کے اس سفر کے عام حالات و واقعات، بیعت رضوان، صلح کے بارہ میں مسلمانوں کے فوری ردعمل، اس کی شرطیں اور اس سے متعلق آیتیں نقل کردی ہیں، دوسرے حصہ میں حجۃ الوداع کے آغاز سے اختتام تک کے تمام حالات و واقعات تاریخ وار بیان کئے ہیں، اس ضمن میں حج کے ارکان و مناسک، خطبۂ حجۃ الوداع اور اس میں بیان کئے گئے احکام کی تشریح کی ہے،

سنہ اور سنہ ۹ھ کے اس حج کا بھی مختصر ذکر ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کو امیر الحج مقرر کیا تھا، اس موضوع پر شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی کی کتاب بڑی مبسوط اور مفید ہے، اس کتاب میں اس سے بہت مدد لی گئی ہے، لیکن مولانا کی کتاب عربی میں تھی اردو میں غالباً یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے، اس کے متن میں جن اشخاص اور جگہوں کے نام آئے ہیں، ان کی اور بعض دوسرے علمی وفقہی مسائل کی حواشی میں توضیح کردی گئی ہے، اور حجۃ الوداع میں آپ ﷺ کے مدینہ سے مکہ کی روانگی اور واپسی کے راستوں کے نقشے بھی دئے ہیں، لیکن اس میں کہیں کہیں ضعیف روایات بھی درج ہوگئی ہیں، ایک جگہ لکھتے ہیں "حضرت میمونہؓ کا انتقال سنہ ۵۹ھ میں ہوا...... ازواج النبی میں سب سے آخر میں آپ کی وفات ہوئی" یہ دونوں باتیں صحیح نہیں ہیں، گو حضرت میمونہؓ کے سنہ وفات کے متعلق مختلف روایتیں ہیں، مگر صحیح روایت سنہ ۵۱ھ کی ہے، اور حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمہؓ کا انتقال ان کے بعد ہوا تھا، ازواج مطہرات میں سب سے آخر میں حضرت ام سلمہؓ کا انتقال ہوا تھا،

پیکر:- از جناب رشید انصاری صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۸۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۵، پتہ آل انڈیا ہندی اردو سنگم باغ انوار لکھنؤ ۳

یہ جناب رشید انصاری کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ہے، انھوں نے غزل کے روایتی پیکر میں نئے حالات ومسائل کی ترجمانی کی ہے، اور فکر نو کو جذبۂ احساس میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے، وہ درد وغم کی لذت آشنا ہیں، ان کو عشق ومحبت کی عظمت وبرتری کا احساس بھی ہے، اور وہ اس راہ کی صعوبتوں پر آہ وفریاد نہیں کرتے بلکہ زخم کھا کر مسکراتے ہیں، ان کے یہاں عشق کی بلند ادائی، غیرت، خودداری، خود اعتمادی، عزم وجہد کا ذکر بھی ہے، اور ترقی وخردمندی کے اس دور کی خامیوں پر ان کی نظر بھی ہے، اس لئے اس مجموعہ میں غزل کی رنگینی ولطافت کے ساتھ اچھے جذبات کے نمونے بھی ملتے ہیں، رشید انصاری نوجوان شاعر ہیں، مشق سے ان کے کلام میں پختگی اور مزید رچاؤ پیدا ہوگا۔

دلاوران اسلام:- مرتبہ خواجہ جمیل احمد صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۲۰۷، مجلد مع گرد پوش، قیمت تحریر نہیں، پتہ اردو اکیڈمی سندھ، کراچی (پاکستان)

مسلمانوں کی تاریخ کا کوئی دور بھی بہادروں اور دلاوروں سے خالی نہیں، یہ کتاب ان کے زریں جنگی کارناموں کا مرقع ہے، اس میں عہد رسالت سے اس صدی تک کے مندرجہ ذیل فاتحین اور سپہ سالاروں کی حربی مہارت اور فتوحات کا تذکرہ ہے، (۱) حضرت امیر حمزہؓ (۲) حضرت علیؓ (۳) حضرت سعد بن ابی وقاصؓ (۴) حضرت خالد بن ولیدؓ (۵) حضرت ابو عبیدہؓ (۶) حضرت عمرو بن عاصؓ (۷) موسیٰ بن نصیر (۸) طارق بن زیاد (۹) محمد بن قاسم (۱۰) یوسف بن تاشقین (۱۱) محمود غزنوی (۱۲) سلطان صلاح الدین ایوبی (۱۳) شہاب الدین غوری (۱۴) بختیار خلجی (۱۵) سلطان بایزید یلدرم (۱۶) صاحبقران تیمور (۱۷) سلطان محمد فاتح (۱۸) ظہیر الدین بابر (۱۹) خیر الدین باربروسہ (۲۰) نادر شاہ افشار (۲۱) احمد شاہ ابدالی (۲۲) حیدر علی (۲۳) ٹیپو سلطان (۲۴) جنرل بخت خان (۲۵) مصطفےٰ کمال (۲۶) شاہ عبد العزیز بن سعود (۲۷) غازی انور بے (۲۸) مہدی سوڈانی، یہ سب نام حسن انتخاب کا نتیجہ ہیں، گو ان سب کی شجاعت اور دلیری کے کارناموں سے اسلامی تاریخیں بھری ہیں، فاضل مصنف نے ان کو بہت سلیقہ سے یکجا کردیا ہے، متعصب غیر مسلم مورخین نے اسلام کے ان بہادروں کو جنگجو اور خونخوار ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اس کتاب کا مقصد اس کی تردید ہے، اس لئے مصنف نے ان حضرات کے جنگی کارناموں کے ساتھ ان کی مروت، شرافت، نیکی، رحمدلی، عدل وانصاف پسندی اور علم وہنر پروری کا بھی ذکر کیا ہے، اور دکھایا ہے کہ انھوں نے جس سرزمین کو فتح کیا وہاں خوش حالی اور فارغ البالی آگئی اور وہ امن وامان اور عدل وانصاف کا گہوارہ بن گئی کیونکہ ان کا مقصد مال وزر اور جاہ وحشمت کی طلب اور کشور کشائی نہ تھا، شروع میں جنگ کا اسلامی مقصد بھی بتایا ہے، اور مشہور اسلامی فتوحات کا تذکرہ بھی کیا ہے، ان کا بیان ہے کہ مسلمانوں کو جنگوں میں کامیا[illegible]

نصیب ہوئی اور جو کبھی شکست ہوئی تو اسکا اور ان کی سلطنتوں کے موجودہ زوال کا سبب حکمرانوں کی بے راہ روی عیش کوشی اور شغل مے دینا ہے، خواجہ جمیل احمد صاحب پاکستان کے انگریزی اور اردو کے مشہور مصنف ہیں، مسلمانوں کے زرین کارنامے ان کی اکثر کتابوں کا موضوع ہے، یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، امید کہ مسلمان اپنے اسلاف کے ان ولولہ انگیز واقعات سے سبق حاصل کریں گے،

دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی ادبی خدمات — مرتبہ جناب مجید بیدار صاحب متوسط تقطیع، کاغذ اچھا کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۴۰۰، قیمت ۸ روپے پتہ (۱) الیاس بک ٹریڈرس، پنج محلہ حیدرآباد (۲) ادارہ فروغ اردو، ۳۷، امین آباد پارک لکھنؤ (۳) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، دہلی،

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کا دارالترجمہ و تالیف کب کا قصہ پارینہ بن چکا ہے لیکن اسکی خدمات فراموش کردینے کی چیز نہیں، زیر نظر رسالہ میں دارالترجمہ کے کارنامے پیش کیے گئے ہیں، یہ سات ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں اسکا پس منظر، قیام کا زمانہ مقصد، اہمیت اور خصوصیت درج ہے، دوسرے باب میں اسکی مجلس وضع اصطلاحات پر گفتگو ہے، اس میں اردو میں اصطلاح سازی کی ضرورت، مجلس کی وضع اصطلاحات کے طریقے اور دوسری خصوصیات بیان کرکے یہ دکھایا ہے کہ وضع اصطلاحات میں کس قدر اہتمام اور کاوش کی جاتی تھی، تیسرے باب میں دارالترجمہ کے اس کارنامہ کا ذکر ہے کہ اسکی بدولت اردو میں مغربی علوم وفنون کی ترویج ہوئی، اس میں ان علوم کی فہرست دی ہے جن پر دارالترجمہ نے کتابیں شایع کیں، کتابوں کی تعداد بھی تحریر ہے، چوتھے باب میں دارالترجمہ کے ۳۰ برسوں کی کارگذاری کا نقشہ ہے، اسمیں مترجمین کے علاوہ کتابوں کے نام اور موضوعات بھی درج ہیں، پانچواں باب دارالترجمہ کے مترجمین وارکان کی عظمت وخدمات پر مشتمل ہے، چھٹے باب میں دارالترجمہ کے اردو پر اثرات واحسانات کا ذکر ہے، ساتویں باب میں اسکے خاتمہ اور بربادی کی غمناک داستان ہے، مصنف نے مجلس وضع اصطلاحات کی ناکامی اور اس پر اہل علم کے اعتراضات کا ذکر کیا ہے لیکن دارالترجمہ کے تراجم کا اس حیثیت سے جائزہ نہیں لیا ہے، یہ کتاب ایم۔ اے کا ایک مقالہ ہے، اس سے دارالترجمہ و تالیف جیسے عظیم الشان ادارہ کا حق پوری طرح ادا نہیں ہوسکا، تحریر میں ژولیدہ بیانی ہے، جملوں کا دروبست ٹھیک نہیں اور بعض لفظوں کا استعمال بھی برمحل نہیں، زبان کی غلطیاں بکثرت ہیں، حالانکہ اب مصنف مولانا آزاد کالج اورنگ آباد کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہیں اور یہ مقالہ انھوں نے جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ اردو کی سابق صدر ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کی نگرانی میں لکھا ہے، اسکی قیمت بھی زیادہ ہے،

"ض"